کیا سائنس ہمیں بچا سکتی ہے؟

تصنیف : جارج لُنڈبرگ

ترجمہ : کپتان عبدالواحد

شیش محل کتاب گھر
شیش محل روڈ
لاہور ۲

تعارف

کیا سائنس ہمیں بچا سکتی ہے؟

واشنگٹن یونیورسٹی کے صدر شعبۂ عمرانیات کا جواب ہے۔ ہاں بچا سکتی ہے۔ لیکن ہمیں طبعی سائنس سے معاشرتی مسائل حل کرنے کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔ پنسلین سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیئے کہ وہ آجر اور اجیر کی کشمکش کو سلجھا دے گی۔ بجلی کے قمقمے ہمارے ذہنوں کی تاریکی اور جذبوں کے اندھیرے کو دُور نہیں کر سکتے۔ جوہری انشقاق سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ہم پر معاشرتی جوہر کی نوعیت اور اُس کا طریق نظام ہم پر منکشف کر دے گا۔ اگر ہمیں بہتر انسانی تعلقات مطلوب ہیں تو ہمیں اپنی تحقیق کا رُخ ان مسائل کے حل کی جانب پھیرنا ہو گا۔

اس کتاب میں یہی نقطۂ نظر اختیار کیا گیا ہے۔ ہر وہ شخص جو موجودہ انسانی معاشرے کی بحرانی حالت سے آگاہ ہے، اس نقطۂ نظر کی پُرزور حمایت کرے گا۔ طبعی سائنس جہاں ہمارے لئے سہولتیں پیدا کر رہی ہے، وہاں اس نے ہمارے لئے کئی انوکھے معاشرتی مسائل بھی پیدا کر دیئے ہیں۔ ان مسائل کا حل فلسفے، عمرانیات، فنون لطیفہ، ادب اور اخلاق میں پوشیدہ ہے۔ اس مختصر کتاب کے سات ابواب میں ان مسائل کے ممکن حل ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہمارے وطن عزیز میں، جہاں معاشرتی اقدار سائنس کے زیر اثر تیزی سے بدل رہی ہیں اور نئے نئے معاشرتی مسائل پیدا ہو رہے ہیں، اس کتاب کا مطالعہ بے حد ضروری ہے اگرچہ اس کے ایک نقاد کے قول کے مطابق "اس کا مطالعہ آسان کام نہیں ہے۔ مطالعہ کرتے وقت بے حد غور و فکر سے کام لینا پڑتا ہے اور معاشرتی ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر محسوس کرنا پڑتا ہے۔"

فہرست

باب-۱

صناعیاتی دور میں قبل سائنسی اندازِ فکر

۱- سائنس معاشرتی مسئلے پیدا کرتی ہے

سائنس نے جس طمطراق سے ۱۹۶۰ اور ۱۹۶۱ میں ترقی کی اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ انسان کے بنائے ہوئے سیارے کرۂ ارض کے مدار میں گھومنے لگے اور اُن فضاؤں اور مظاہر کی اطلاعیں بھیجنے لگے جو اب تک نامعلوم تھے۔ ماہرین متفق ہیں کہ جلد ہی انسان ان فضاؤں کا بلکہ ان سے بھی پرے سفر کرے گا۔ اِس کے ساتھ ہی اتنی ہی ترقی مسائیلوں اور دیگر مہلک ہتھیاروں میں ہوئی ہے جن سے اسی پود کی امکانی تباہی کا بھوت سامنے آکھڑا ہوا ہے جس نے یہ محیر العقول ایجادیں کی ہیں۔ چنانچہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا موجودہ پود یا اس کے اخلاف (اگر کوئی ہوئے تو) انسان کے معاشرتی روابط کے

ایسے علوم وضع کر سکیں گے جو اُن قوتوں اور آلات کو جو اب پہلی بار انسان کے قبضے میں آئے ہیں تعمیری طور پر استعمال کر سکیں۔ اس سوال کے پیشِ نظر اور اپنی ایجادوں کے امکانی نتائج سے خائف ہو کر خود ماہرین طبیعیات بعض اوقات اس مطالبے سے ہمنوا ہو جاتے ہیں کہ کچھ عرصے کے لئے طبیعیات ہی سے کام لینا ملتوی کر دیا جائے۔ تاہم قطع نظر اس سے کہ اس کے نتائج کیا ہوں، سائنس رواں دواں ترقی کر رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بہت کم اشخاص سائنس کی اہمیت اور توقعات کو محل نظر ٹھہراتے ہیں۔ کم و بیش ہر شخص معترف ہے کہ گو سائنس کی ترقی سے کتنی ہی مصیبتیں پیدا ہوئی ہوں، اس میں کلام نہیں کہ اس نے ہمیں بعض قدیم خدشات اور اضطراب کے موجبات سے نجات دلائی ہے۔ طبیعی علوم نے بلاشبہ ہمیں اپنے بیشتر دیرینہ حریفوں پر بالادستی عطا کی ہے گو ہم ان قوتوں کو ہمیشہ استعمال نہیں کرتے۔ اگرچہ ہم قدرتی حوادث کو رد کرنے میں بے بس ہیں سائنس بہرحال دو طرح بے بہا ثابت ہوئی ہے۔ اول: سائنس ہمیں بعض حوادث سے پیش از وقت خبردار کر دیتی ہے۔ اور یوں ہمیں ان کے زیادہ خطرناک عواقب سے بچنے کے قابل بنا دیتی ہے۔ اگر بارش کی پیش گوئی کی جائے تو ہم چھاتہ لے کر باہر نکلتے ہیں۔ جہازوں کو خبردار کیا جاتا ہے کہ طوفان باد و باراں فلاں راستے سے آ رہا ہے۔ موذی ٹیکوں سے ہم بعض امراض سے بچ سکتے ہیں۔ وغیرہ، دوم: طبیعی کائنات کے متعلق ہماری سائنسی معلومات اور ہمارا سائنسی نقطۂ نظر خود اس کے

ضامن ہیں کہ ہمیں خدشوں، جذبات کے طوفانوں اور اِسراف توانائی کے دوسرے موجبات سے رہائی حاصل ہو۔ جن میدانوں میں سائنس کارفرما ہو وہاں وہ ذہنی حفظانِ صحت کا کام کرتی ہے۔ اگر ہم اخبار میں زلزلے، گرہن، آندھی یا سیلاب کی خبر پڑھیں تو ان حوادث کو ہم فوراً سائنس کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور یوں ان کے دیگر حوادث سے روابط نمایاں ہو کر ان کی توجیہ ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس قسم کا ہر نیا واقعہ ہمارے لیے ذہنی یا جذباتی کوفت کا باعث نہیں بنتا کیونکہ ہم اپنے آپ کو اس سے ذہنی طور پر ہم آہنگ کر لیتے ہیں۔

اس کے برعکس سیاسی اور معاشرتی تغیرات مثلاً جنگیں، انقلابات اور جرائم اکثر افراد کے لیے صدمے، باہمی الزام دہی اور دیگر جذباتی اظہارات کا موجب بنتے ہیں۔ موجودہ معاشرتی حالات کے بیشتر مبصروں کی اضطرابی کیفیت واضح تجزیے کے لیے سازگار نہیں ہوتی۔ سیلاب، بادوباراں کے طوفان اور فصلوں کی ناکامیاں بھی ہمیں پریشان کرتی ہیں لیکن ان کے متعلق ہمارا رویّہ اُس سے بہت مختلف ہوتا ہے جو معاشرتی مصائب کے متعلق ہوتا ہے۔

چنانچہ یہ بات تعجب انگیز نہیں کہ انسان اس سوال میں بتدریج زیادہ دلچسپی لے رہا ہے کہ ہم اسی حربے کو جسے سائنس کہتے ہیں معاشرتی مشکلات کے حل میں بھی استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں۔ لیکن اس سوال پر شدید ترین اختلافات ہیں۔ کئی مفکروں کا خیال ہے کہ معاشرتی مشکلات میں تخفیف

کرنا تو کجا سائنس نے انہیں اور بھی سنگین بنا دیا ہے۔ رابرٹ ہچنز کے قول کے مطابق "دنیا بیک وقت دو مخالف مقامات پر پہنچ گئی ہے معلومات، صناعیات اور فطرت پر استیلا کی سمت الراس اور اخلاقی اور سیاسی انحطاط کی سمت النظیر۔"

قطع نظر اس سے کہ یہ قول مبالغہ آمیز ہے یا نہیں اور قطع نظر اس منطقی سقم سے کہ اگر دو حوادث ایک ساتھ یا یکے بعد دیگرے رونما ہوں تو ایک لازمی طور پر دوسرے کی علّت نہیں ہوتا یہ بہرحال درست ہے کہ طبعی اور حیاتیاتی سائنس کی ترقی نے موجودہ زمانے کے نمایاں مسائل، جو انسانی روابط کے مسائل ہیں، حل نہیں کئے۔

یہ کسی طرح بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ صنعتی محاصل کی بہتری اور کارکنوں کی قوت خرید کی افزائش سے آجر اور اجیر کے تعلقات زیادہ باامن اور دوستانہ ہو گئے ہیں۔ معیار زندگی کی بلندی، بہتر صحت اور وافر فصلوں نے گروہوں اور قوموں کو زیادہ پر امن اور ہمدرد نہیں بنا دیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ ترقیاں پسندیدہ نہیں ہیں لیکن ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ وہ از خود ہمیں امن اور رواداری کے راستے پر گامزن نہیں کرا سکتیں۔

تو پھر ہمیں معاشرتی مسائل کے بارے میں کس طرف رجوع کرنا چاہیئے؟

۲۔ کیوں نہ ہم سائنس کو آزمائیں؟

اس کرۂ ارض پر اپنے طویل عرصۂ حیات میں انسان نے

اپنے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی کم و بیش کامیاب کوشش کی ہے۔ اس داستان کا اعادہ ضروری نہیں۔ اس کے نمایاں خط و خال سے سب واقف ہیں۔ صرف اتنا کہہ دینا ہی کافی ہوگا کہ وہ سائنسی منہاج جسے طبیعیاتی علوم میں گزشتہ چار صدیوں سے ترقی دی گئی ہے بعض قدیم مشکلات کے حل میں بے حد موثر ثابت ہوا ہے۔ مثلاً سردی ، تاریکی ، قحط ، وبائیں ، ذرائع رسل و رسائل ، حمل ونقل اور انسان کی ہزارہا اور دیرینہ ضروریات ۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ آج انسان اپنے آپ کو انسان ہی کی طرف سے ایسے خطرات میں گھرا ہوا پاتا ہے جو اس سے سائنس کی مہیا کردہ بہترین سہولتیں چھیننے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ شاید یہ بڑی حد تک اس کی صناعیاتی کامیابیوں کا نتیجہ ہے۔

اس تشویشناک صورتِ حال میں وہ اُن منہاجوں کی طرف رجوع کیوں نہیں کرتا جو دوسرے میدانوں میں اتنے موثر ثابت ہوئے ہیں ؟

بڑی وجہ تو بس روایت ہے۔ عام طور پر ابھی تک انسانی روابط کو سنجیدہ سائنسی مطالعے کے لیے موزوں موضوع نہیں سمجھا گیا ۔ اب تک سائنس کی نمایاں کامیابیاں ایسے میدانوں میں ہوتی ہیں جیسے صحت ، مصنوعی کھاد اور اصلاح دادہ میکانکی آلے ۔ چنانچہ انھی کو سائنسی تحقیق کا مناسب موضوع سمجھا جاتا ہے۔

یہ درست ہے کہ آج کل "عمرانیات" اور انسانی امور کے متعلق سائنسی رویے اور مختلف "سائنسی" اصلاحی تحریکوں کا بہت چرچا

ہے۔ لیکن تھوڑے سے ہی غور سے معلوم ہو جائے گا کہ کوئی بھی، یہاں تک کہ ماہرین عمرانیات بھی، ان معاملات میں سائنس کو حقیقی اہمیت نہیں دیتے۔ جب اس کا اطلاق انسانی روابط پر ہو تو لفظ "سائنس" کو محض تعظیمی اہمیت دی جاتی ہے۔ اکثر اشخاص کے نزدیک سائنس بعض طبیعیاتی میدانوں میں قابلِ اعتماد جادو کا نام ہے اور اس طرح یہ لفظ طلسم کا اثر رکھتا ہے۔ لہٰذا اسے ہر طرح کے معاشرتی پروگراموں پر چسپاں کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ فی اُن لیمپ اور ریڈیو ٹیوب کی مستعار سربلندی سے سرافراز ہو جائیں۔ سچ تو یہ ہے کہ معاشرتی علوم (یعنی معاشیات، عمرانیات، نفسیات، انسانیات اور سب سے بڑھ کر سیاسیات) کے ماہرین خود اس بات کے قائل نہیں کہ ان کے حلقہ ہائے کار میں سائنس وہی غیر ذاتی، کڑا اور اخلاق سے بے تعلق انضباط ہے، اور ہونا چاہیئے، جو وہ طبیعیاتی دنیا میں ہے۔ سائنس مقابلۃً نیا اندازِ فکر ہے۔ اور ابھی اس نے ذہنوں میں اتنی سرایت نہیں کی کہ وہ انسانی روابط کے مسائل حل کرنے میں ممد ہو سکے۔ معاشرتی مسائل کے متعلق ہمارا آج کل کا غالب اندازِ فکر ایک قانونی اخلاقی، ادبی رجحان ہے جسے ہم نے طبیعی ماحول سے مطابقت پیدا کرنے میں بڑی حد تک خیرباد کہہ دیا ہے۔ یہ قدیم اندازِ فکر لوگوں کے جمالیاتی اور جذباتی احساسات میں گہرا گڑا ہوا ہے لیکن اس سے وہ نتائج حاصل نہیں ہوتے جن کی سائنس متمنی ہے۔ ہم اس موضوع کی طرف ایک آئندہ باب میں رجوع کریں گے۔

اس کی دوسری وجہ کہ معاشرتی علوم میں زیادہ دلچسپی کیوں نہیں لی

جاتی یہ ہے کہ اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کے پاس انسانی روابط کے مسائل کے حل پہلے ہی موجود ہیں یہ حل کیا ہیں؟ بس یہی کہ "دیانت داری سے دن بھر کام کرو اور دن کی پوری اُجرت لو"، اوامر عشرہ"، "زریں اصول"، اشتمالیت۔ آزاد تجارت، اشتراکیت۔ تعاون باہمی۔ ایک اور عالمی کانفرنس عالمی اتحاد۔ وغیرہ۔ یہ تصور کہ کسی نصب العین کا محض اظہار اس کے حصول کا بھی ذریعہ ہے طلسمی فکر کی یادگار ہے۔ سائنس مطمحائے نظر کا بدل نہیں ہے۔ وہ ان کے حصول کا سب سے کارگر ذریعہ ہے۔ درحقیقت ہمیں معلوم نہیں کہ مختلف حالات کے تحت یہ مثالی پروگرام کتنے قابلِ عمل یا موثر ہوں گے۔ نہ ہی ہمیں یہ معلوم ہے کہ ان کی افادیت اور اہمیت کا تخمینہ اور توضیح کیسے کی جائے۔ اِن امور کا انکشاف اور توضیح معاشرتی علوم میں تحقیق کا ایک مقصد ہے۔

قبل سائنسی انداز ہائے فکر کا نتیجہ جہالت اور کینہ پروری ہوتا ہے جس کا بین الاقوامی امور کے انصرام پر تباہ کن اثر پڑتا ہے۔ اس کی مثال امن کے وہ معاہدے ہیں جو دونوں عالمی جنگوں کے بعد عمل میں آئے۔ ثالثوں پر سیاسی اور دوسرے دباؤ تو تھے ہی لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ امن کانفرنسوں کی اہم ترین شخصیتیں اس قسم کے علم سے جو واقعی اہم تھا بے بہرہ تھیں۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد کے تصفیے کا ذکر کرتے ہوئے ایچ۔ جی۔ ویلز یہ رائے ظاہر کرتا ہے: "یہ لوگ اس مسئلے کے متعلق جو انھیں درپیش ہے کچھ نہیں جانتے۔ یوں تو ان میں سے کوئی بھی زیادہ

علم نہیں رکھتا لیکن وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ انھیں کیا جاننا چاہیئے۔ وہ یہ اور یہ فیصلہ کرتے ہیں جس سے وہ اور وہ نتیجہ برآمد ہونا چاہیئے لیکن وہ ایسے اقدامات نہیں کر سکتے یا نہیں کرنا چاہتے جن سے وہ نتیجہ مترتب ہو۔ وہ موثر غور و خوض کے اس قدر غیر عادی ہیں اور اس قدر بے علم ہیں کہ وہ نہیں جانتے کہ علم موجود ہے اور علم کیا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ علم کی کوئی اہمیت بھی ہے۔"

اس صورت حال پر مسٹر ویلز نے یہ مزید تبصرہ کیا ہے۔" ذہنی کوتاہی کا ایسا ہی خطرناک احساس ہم میں سے اُن چند افراد کو ہو رہا تھا جو جمعیت اقوام کو معرضِ وجود میں آتے دیکھ رہے تھے۔ ہم بادل ناخواستہ اور بڑی دہشت سے محسوس کر رہے تھے کہ وہ لوگ جو بزعم خویش تاریخ انسانی کا ایک نیا ورق الٹ رہے تھے اور ایک نیا باب کھول رہے تھے۔ مجموعی طور پر ان قوتوں کے متعلق جو تاریخ کی تشکیل کرتی ہیں کچھ بھی نہ جانتے تھے۔ میں نے مجموعی طور پر کہا ہے۔ فرداً فرداً ان کا علم کافی وسیع تھا لیکن وہ صحیح علم کے غیر مربوط ٹکڑوں کا ملغوبہ تھا۔ ان میں سے بعض ایک تاریخی دور کے متعلق اچھا علم رکھتے تھے اور بعض کسی اور کے متعلق، لیکن وہ مجموعی طور پر اُن عوامل کو بالکل نہیں سمجھتے تھے جن کی انھیں سمت معین کرنی تھی۔

" اگر میں جنگ کے بعد کی اٹھارہ سالہ تاریخ کی روش کے متعلق تعمیم کرنے کی جسارت کر دوں تو میں کہوں گا کہ یہ لغزشوں، بے مقصد

تحریکوں، سست رفتاریوں اور تند ہنگاموں کا سلسلہ تھی - اور یہ اس لئے بیحد المناک ہے کہ انسان فطری طور پر ذہین ہے ، اس کے احساسات تیز ہیں ، وہ اپنی ذات کا اظہار موسیقی اور ادب میں کر سکتا ہے - لیکن افسوس یہ ہے کہ بہت کچھ جانتے ہوئے بھی وہ بے بس ہے ۔"

اس کے دس سال بعد ہمارے ایک نہایت ہی ذہین رکنِ سفارت نے جس کا ہمارے محکمہ خارجہ میں پچیس سال کا تجربہ ہے ان خیالات کا اظہار کیا :

" سب سے پہلے میں مختصراً یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان دو عالمی جنگوں کے یورپ میں کیا نتائج نکلے ہیں - ان جنگوں میں کروڑوں جانیں کام آئیں ، برِاعظم پر توازن قوت کی بے پناہ تباہی ہوئی اور مغربی یورپ خطرناک طور پر اور غالباً ہمیشہ کے لئے روس کی جارحانہ کارروائیوں کا ہدف بن گیا - جب آپ ان دونوں جنگوں کے مبینہ مقصد کی روشنی میں ان کے کل نقصانات کا اندازہ کریں تو آپ پر عیاں ہو جائے گا کہ اگر ان سے کوئی فائدہ ہوا بھی ہے تو وہ غیر محسوس سا ہے - کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم نے کہیں بہت بڑی غلطی کھائی ہے ؟ "

ہم آج بھی یہی حماقت دہرا رہے ہیں کیونکہ پہلی عالمی جنگ کے بعد سے وہ بنیادی شرائط نہیں بدلیں جن پر تصفیۂ امن کا دارو مدار ہے - وہ شرائط یہ ہیں - اوّل : عمرانی علوم اس حد تک ترقی یافتہ ہونے چاہئیں کہ وہ دیرپا امن کی مقتضیات کی واضح طور پر نشان دہی کر سکیں - دوم : عوام

میں عمرانی علوم کی ایسی قدرو منزلت ہونی چاہیئے کہ ان کی آواز امن کانفرنس کی میز پر موثر ہو۔ خاص کر دوسری شرط تو ابھی بالکل ہی پوری نہیں ہوئی۔

بعض کہیں گے کہ جس چیز کی ہمیں ضرورت ہے وہ زیادہ علم نہیں بلکہ جو علم ہمارے پاس ہے اُسے استعمال کرنے کا عزم ہے۔ لیکن یہ عزم بھی تو بعض شرائط پر مبنی ہے۔ آخر ہم اپنے علم کا استعمال کیوں نہیں کرتے؟ یہ سوال طبیعیاتی اور عمرانی ہر دو علوم سے تعلق رکھتا ہے۔ بعض اوقات بعض امراض کا علاج دریافت ہو جانے کے بعد برسوں اور نسلوں تک عوام کو اُسے آزمانے پر آمادہ نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کی وجوہات متعدد اور پیچیدہ ہیں۔ درحقیقت یہ سوال خود تحقیق کا مستحق ہے۔

اس ضمن میں بھی ایسے لوگ موجود ہوں گے جو سمجھتے ہیں کہ ان کے پاس جوابات پہلے ہی موجود ہیں۔ ان میں سب سے عام جواب یہ ہے کہ تعلیم ہی تسلی بخش علاج ہے۔ بس ہر شخص کو سائنسی علاجوں سے آگاہ کر دیجئے۔ ہر شخص کو یہ بھی بتا دیجئے کہ اگر وہ اُن عادات، امتناعات اور توہمات سے چمٹا رہے جو اسے سائنسی نتائج اختیار کرنے سے باز رکھتے ہیں تو یہ اس کی حماقت ہے۔ وہ ٹھوس جزئیات جن سے یہ بظاہر مختصر اور آسان پروگرام پورا ہو سکتا ہے خود بھی اگر واہمہ نہیں تو ایک ناظر ضرور ہیں۔ کیونکہ تعلیم کوئی ایسا بیرم نہیں جو معاشرے کی اصلاح کے لئے اس کے باہر لگا ہوا ہے۔ تعلیم ایک ایسا عمل ہے جو اسی پس ماندہ، احمقانہ اور توہم پرست معاشرے سے تقویت حاصل کرتا ہے جس کی وہ اصلاح

کرنا چاہتا ہے۔ جو علم ہمارے پاس پہلے ہی موجود ہے اسے ہم استعمال کیوں نہیں کرتے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ایسے سوالات کے متعلق بہت ہی کم مثبت علم ہے۔ ہمارے پاس کوئی ایسے قابل تصدیق کلیے نہیں جو اور علوم میں موجود ہیں اور جن کے ذریعے وہ حیرت انگیز نتائج پیدا کرتے ہیں۔

بہر حال یہ سوال کہ کیا تعلیم ہمارے معاشرتی مسائل کے حل میں مدد دے گی تعلیم کی صحت پر مبنی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہم معاشرتی موضوعات کی جو تعلیم دے رہے ہیں وہ بیکار سے بھی بدتر ہے کیونکہ اس سے ہم پہلی پشتوں کی غلطیوں، تعصبات اور قیاسات کو جاری رکھ رہے ہیں۔ جب تک علم کو سائنسی تحقیق سے بار بار پرکھا نہ جائے اور اس میں اس سے اضافہ نہ کیا جائے تعلیم معاشرتی اصلاح کی موجب ہونے کی بجائے ایک مضر شے ثابت ہو سکتی ہے۔

اس عقیدے کی ایک اور صورت کہ ہم معاشرتی مسائل کے متعلق پہلے ہی وہ سب کچھ جانتے ہیں جس کی ہمیں ضرورت ہے یہ احساس ہے کہ اگر سائنسی حل موجود ہوں بھی تو وہ ناقابل عمل ہوتے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ایسے افراد ہمیشہ موجود ہوتے ہیں جو اسی عدم مطابقت سے فائدہ اٹھاتے ہیں جس کا نتیجہ جنگ، معاشی سرد بازاری اور اقلیتوں سے بے انصافی جیسے معاشرتی مسائل ہوتے ہیں۔ ایسی صورت حالات صرف معاشرتی علوم ہی سے مخصوص نہیں ہے۔ طبیعاتی اور حیاتیاتی علوم

کی ہر پیش قدمی کی بھی اسی طرح مخالفت کی گئی ہے۔ یہ مخالفت ایسے اشخاص نے کی جو جہالت، توہم پرستی یا سائنسی تدابیر سے پہلے کی پرفریب اصلاحی تحریکات سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ آخر کار جب سائنسی تدابیر کی برتری ثابت ہوگئی تو ان جہالت کے نفع اندوزوں کو شکست ہوئی۔

چنانچہ یہ کہنا درست نہیں کہ چونکہ لوگوں کی کثیر تعداد ان حلوں کی متمنی ہی نہیں اور نہ ہی انھیں قبول کرنے کی ضرورت محسوس کرتی ہے اس لئے معاشرتی مسائل کے سائنسی حلوں کو خاص مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ دراصل سائنسی حل خود اپنے اندر منوانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ سائنسی منہاجوں کی ثابت شدہ برتری ہی اس کا بڑا باعث تھی کہ ان اجارہ داریوں کو جو سائنس کی مخالف تھیں بالآخر شکست ہوئی۔ یہ بھی ہے کہ جب ایک دفعہ سائنسی معیاروں کو کسی گروہ میں آخری حکم مان لیا جائے تو ان کی قطعیت پر کسی کو شبہ نہیں رہتا۔ اگر پانی کی پاکیزگی پر یا اس پر کہ آیا فلاں شخص کسی متعدی مرض کا شکار ہے یا نہیں اختلاف رائے ہو تو ہم ماہرین سائنس کا فیصلہ مان لیتے ہیں گو اس سے اپنا مالی نقصان ہی کیوں نہ ہو اور ایک آزاد شہری کو عزلت گزین ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

حمایات کے خلاف جو اعتراضات اوپر بیان کئے گئے ہیں وہ گو کمزور ہیں لیکن بیشتر لوگوں کو کم و بیش قطعی معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ انسانی روابط کے بارے میں سائنس سے استمداد کرنا ممکن ہے نہ ضروری۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرتی مسائل کا حل کسی اور

جگہ تلاش کیا جاتا ہے۔ بہت لوگ اب بھی آسمان کی طرف دعا کے لئے ہاتھ اُٹھاتے ہیں۔ اس کی یا تو یہ صورت ہوتی ہے کہ کسی نجات دہندہ کی طرف آنکھیں لگائی جاتی ہیں یا ستاروں سے فال لی جاتی ہے۔ نومبر ۱۹۴۵ء کی اخباری رپورٹوں کے مطابق نیویارک میں پچیس ہزار نفوس" مقدس دوشیزہ" کا ظہور دیکھنے کے لئے جمع ہوئے۔ جوتشی جو چائے کی پتیوں، کھجوروں، تاش کے پتوں، تحریر اور ستاروں سے فال لیتے ہیں سب سے" ترقی یافتہ" اور" سائنسی" ملک کے باشندوں سے ہر سال کروڑوں ڈالر اینٹھ لیتے ہیں۔ لوگوں کو اپنی ہی سادہ لوحی سے بچانے کی کوشش میں کئی قانون وضع کئے گئے ہیں لیکن ایک مقبول عام میگزین کے مطابق" جہاں پیش گوئی کرنا ہر ریاست میں خلاف قانون ہے انسانی مسائل پر مشورہ دینے کے خلاف کوئی قانون نہیں۔"

دوسرے لوگ جو اپنے آپ کو منجموں سے بہت برتر سمجھتے ہیں لیکن درحقیقت ان سے قریبی مشابہت رکھتے ہیں" انسان عظیم" یا" قائد اعظم" کے ظہور پر ایمان رکھتے ہیں۔ ایک سے زیادہ ملکوں کی حالیہ تاریخ میں اس عقیدے کی لغویت اور مقبولیت کی نمایاں مثالیں ملتی ہیں۔ اس عقیدے کی ایک صورت یہ ہے کہ" زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو" یہ خیال کہ" پانچ کروڑ نفوس غلطی نہیں کرسکتے"۔ ہر معاشرتی یا معاشی مسئلے کے سائنسی حل کا قطعی رد سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ صدر روزویلٹ بھی روزمرہ کی اہم مشکلات کے امکانی حل کے لئے عوام سے موصول شدہ

خطوط دیکھا کرتا تھا۔ اگر ہم سلفا (SULPHA) دواؤں کی تاثیر کا فیصلہ عام رائے شماری سے کرائیں تو ہم اسے احمقانہ فعل سمجھیں گے۔ لیکن اس کے باوجود جب ہم معاشرتی سوالات کے حل کے لئے بعینہٖ یہی طریقہ استعمال کرتے ہیں تو ہم اپنے آپ کو حق بجانب، جمہوریت پسند اور روشن خیال محسوس کرتے ہیں۔

جب سلفا دواؤں یا خاص معاشرتی تدابیر کی نوعیت اور تاثیر معلوم ہو جائے تو یہ سوال کہ آیا ہم انہیں اختیار کریں یا نہیں عام رائے شماری سے طے کیا جا سکتا ہے۔ انسانی روابط میں سائنس کی فرمانروائی اور رائے عامہ کا اپنا اپنا مقام ہے۔ اس امتیاز کا نہ سمجھ سکنا آج کل کی مشکلات کا بڑا باعث ہے خاص کر ان ملکوں میں جو جمہوری ادارے برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہی اُلجھن معاشرتی اور طبیعی امور میں موزوں سائنسی رہنمائی مہیا نہ کر سکنے کا بھی بڑی حد تک باعث ہے۔ یہاں ہمیں اس جمہوریت کی سطحیت بھی تسلیم کر لینی چاہیئے جو دراصل موجودہ زمانے کی آمرانہ ذہنیت کی ایک صورت اور آج کل کی جذباتی آرزو ہے۔ جب "جمہوری" ملکوں کے باشندے اپنی انتہائی تمناؤں اور آرزوؤں کا اظہار کرتے ہیں تو وہ کس قسم کا معاشرتی نظام چاہتے ہیں؟ کیا وہ ایسا نظام ہوتا ہے جس میں حقیقت سائنس کے محنت طلب طریقوں سے معین کی جاتی ہے اور اس کا اطلاق جمہوری طریقوں سے کیا جاتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ تمام مفکروں کے مطابق اس بہشت ارضی کی نوعیت مطلق گو خیر اندیش

آمریت ہے ۔

ہمیں قنوطائیت، اشتراکیت، جمہوریت ایسے تصورات کے خبط میں مبتلا ہونے سے خبردار رہنا چاہیئے ۔ اس کی بجائے ہمیں ایسے ٹھوس سوالات سے سروکار رکھنا چاہیئے کہ کوئی تجویز، قطع نظر اس سے کہ اس کا نام کیا ہے، وہ عام تشفیاں جن کے سب متلاشی ہوتے ہیں کس طرح اور کس حد تک مہیا کر سکتی ہے ۔ ایسی صورت حال میں معلم اخلاق اور فلسفی کی نہیں بلکہ ماہر سائنس کی ضرورت ہوتی ہے ۔ فلسفی کا ایک دل پسند قول یہ ہے کہ "نصب العین کے بغیر تباہی ہے" ۔ سائنس اس مقولے سے بیزار نہیں ۔ خود سائنس کی تمام جدوجہد کا مقصد ایک نصب العین ہی کا حصول ہے ۔ یعنی ایسا مفروضہ جو سائنسی سرگرمی کو ایک سمت، ایک مفہوم عطا کرے ۔ لہذا انسانی سعی میں نصب العین کی اہمیت کو سائنس دان سے بہتر کوئی نہیں پہچانتا ۔ لیکن سائنس دان یہ بھی جانتا ہے کہ اختیار کردہ نصب العین کی نوعیت پر بھی بہت کچھ منحصر ہوتا ہے ۔ وہ لوگ جو مختلف نصب العینوں کی اندھا دھند پیروی کرتے ہیں اور ان میں امتیاز نہیں کرتے پاگل خانوں میں دھکیل دئے جاتے ہیں تاکہ انہیں اور ان کے ہم وطنوں کو ان کے بے محل اور بیہودہ مقاصد سے بچایا جائے : الغرض غیر ذمہ دارانہ اور لغو نصب العین بھی تباہی کا باعث ہوتے ہیں ۔

انسانی امور میں نصب العینوں کے علم برداروں کے لئے غالباً یہ بہتر ہوگا کہ وہ اس معاملے کے عملی پہلو پر زیادہ زور دیں ۔ یہ درست

ہے کہ یہ خیال بیشتر مباحث میں مضمر ہوتا ہے ۔ یعنی جب لوگ نصب العین کی حمایت کرتے ہیں تو عام طور پر ان کا مطلب پسندیدہ اور قابل حصول مقاصد ہوتا ہے ۔ تاہم معاشرتی نصب العینوں پر بہت زیادہ غائر نظر کی اشد ضرورت ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس برائے نام نصب العین پر کڑی نگرانی کی ضرورت ہے جو اشتہارباز ، پیٹنٹ دوا فروش ، اور علاج یا دعا کرنے والے پیش کرتے ہیں ۔ اس خیال سے بلاشبہ عظیم صدمہ ہوتا ہے کہ وہ نصب العین جن کے لئے لوگ بعض اوقات جانیں دے دیتے ہیں اور جن کے لئے رہنماؤں کی تعظیم کی جاتی ہے کبھی کبھی بھاری فریب اور انتہائی جہالت کے مترادف ہوتے ہیں ۔

ہمیں دو قسم کے غیبیت پرستوں کے درمیان احتیاط سے امتیاز کرنا چاہیئے ۔ ایک وہ جو کہتے ہیں کہ وہ عالم جو وہ بصیرت کی آنکھ سے دیکھتے ہیں اس دنیا سے ماورا ہے اور دوسرے وہ جو کہتے ہیں کہ ان کے پروگرام سب کے لئے ، ہر جگہ اور ہمارے ہی زمانے میں مفید ہیں ۔ یہ درست ہے کہ کوئی بھی اُن نصب العینوں پر معترض نہیں ہوتا جو غیب دان اور دانش مند انسان کی عاقبت اور کامل خوش حالی کے لئے مقرر کرتے ہیں نہ ہی سائنس کا یہ مقصد ہے کہ لوگوں کو اُس رومانی ادب اور تشفی سے محروم کر دیا جائے جو قصے کہانیوں سے حاصل ہوتی ہے ۔ اس میں کلام نہیں کہ یہ تخیلی کائناتیں زندگی کا لطف دوبالا کرتی ہیں اور کیمیادار پیرا شدانہ ہوتی ہیں ۔

اسی وجہ سے فراریت کی جو کم و بیش بے سوچے سمجھے مخالفت کی جاتی ہے وہ درست نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر حقیقت اور افسانے اور عمل اور تخیل میں امتیاز نہ کیا جائے تو یہ افسوس ناک ہے۔ زندگی کے تفکرات سے فرار کی تمنا ہمیشہ موجود رہی ہے۔ اس فرار کے تصور سے مسرت حاصل ہوتی ہے جو دل و دماغ کو تازگی بخشتی ہے۔ مختلف لوگ فرار کی مختلف راہیں اختیار کرتے ہیں۔ بعض کو یہ فرار ریاضیات اور فلسفے میں ملتا ہے۔ بعض کو مذہب میں، بعض کو موسیقی میں، بعض کو شعر میں، اور بعض کو دور دراز سیاروں کی متحرک تصویروں میں۔ مجھے موخر الذکر کے خلاف بھی کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ ناظر تماشے کے اختتام پر کار میں بیٹھ کر گھر نہ جائے۔ تمام تاریخی داستانوں، تخیلی ادب، رویاؤں اور نصب العینوں پر بھی بعینہٖ یہی شرط عائد کرنی چاہیئے۔ بے لگام معاشرتی عینیت جس کے امکانات اور مصارف کو سائنسی اصولوں سے متوازن نہ کیا گیا ہو ایک معاشرتی بار ہے اور عملاً وطن کے ساتھ فریب ہے۔

ماہرین عمرانیات معاشرتی عینیت کے پیشہ ور حامیوں کے مقابلے میں کافی گھاٹے میں رہتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ دیانت دار طبیبوں کی نیم حکیموں کے مقابلے میں یہی حالت تھی۔ موخر الذکر سریع اور بے تکلیف علاج کا وعدہ کرتے تھے۔ محنت طلب تشخیص کی ضرورت تھی نہ طول طویل معالجے کی۔ ماہرین عمرانیات کی پیش کشیں آج کم اثر، ناقابل اعتماد، تکلیف دہ اور گراں معلوم ہوتی ہیں اور اس کے برعکس معاشرتی عینیت کے پیشہ ور

حامیوں کی تجویزیں، جن سے اخبار اٹے ہوتے ہیں اور جو وہ گرج گرج کر سٹیج سے پیش کرتے ہیں، بڑی قابل قدر معلوم ہوتی ہیں۔ سائنس کے بھی اپنے نصب العین ہوتے ہیں لیکن اس میں اتنی شرافت ضرور ہے کہ وہ وضاحت سے بتا دیتی ہے کہ یہ خاص حالات اور زمانوں میں کس حد تک ممکن الحصول ہیں۔

غالباً ایک وقت آئے گا جب بغیر ذمہ دار عینیت پرستوں کا گندم نما جو فروشوں سے زیادہ احترام نہیں کیا جائے گا۔ آج کل عینیت پرست ملک میں گھومتے پھرتے ہیں اور ایسی تجویزیں پیش کر رہے ہیں جو دھوکا بازی میں ٹوٹکوں اور سانڈے کے تیل سے کم نہیں۔ اس کے باوجود یہ لوگ آج کل کے محترم لیڈر ہیں۔ یہ درست ہے کہ جہاں سانڈے کا تیل بیچنے والا جانتا ہے کہ وہ فریبی ہے اکثر معاشرتی عینیت کے پرستار اپنے کہے پر ایمان رکھتے ہیں۔ بہرحال اس سے ان کی اپنی اپنی پیش کردہ تجاویز کی حقیقت یا ان کے تباہ کن نتائج پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ دروغ گوئی کے متعلق ہٹلر کا مبینہ مشورہ کہ بڑا جھوٹ چھوٹے جھوٹ کی نسبت زیادہ آسانی سے مانا جاتا ہے، معاشرتی عینیت کی ایک خاص قسم کے بارے میں بھی درست معلوم ہوتا ہے۔ ایک مقامی امدادی پروگرام جو معاملے کو اور سنگین بنا دے فوری اور کڑی نکتہ چینی کا ہدف بنتا ہے لیکن "امداد خارجہ" کی عالمگیر پالیسی کو انسان دوستی اور سیاسی وجوہات کی بنا پر بڑی حمایت حاصل ہو جاتی ہے۔ گویہ بآسانی ثابت کیا جا سکتا

ہے کہ اگر شرح پیدائش و اموات پر قابو نہ پایا جائے تو امداد میں ہر اضافے سے بھوکے لوگوں کی وہ تعداد بڑھ جاتی ہے جو امدادی پروگرام کے آغاز سے پہلے تھی۔ (دیکھئے صفحہ ۷۱ تا ۷۷)

جو لوگ ان پرشکوہ منصوبوں کی تفصیلات کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان کے مجوزہ اخراجات اور کامیابی کے امکانات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں انہیں انسان دشمن اور رذیل کہہ کر ان کی خبر لی جاتی ہے۔ تاہم اگر بعض حقائق اور اصولوں کو جنہیں اب ماہرین عمرانیات جانتے ہیں ذرا زیادہ اہمیت دی جائے تو ان منصوبوں کی نوعیت جو سب قوموں کے مدبرین چلا رہے ہیں بڑی حد تک بدل جائے اور اس طرح ہر ملک کے باشندوں کو فائدہ پہنچے۔

انسانی معاملات میں نصب العین کے اثر اور قوت کو کسی نے کبھی محل نظر نہیں ٹھہرایا۔ دراصل یہ تصنیف خود عینیت پرستانہ ہے۔ لیکن ماہرین سائنس کاملیت کا مشورہ نہیں دیتے نہ ہی ناقابل حصول مقاصد کی حمایت کرتے ہیں۔ سائنس کی معقولیت خود درجے کا سوال ہے۔ چنانچہ نئے سائنسی میدانوں میں ماہر سائنس اور عطائی میں امتیاز کرنا بعض اوقات مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ بہر حال مسلم ہے کہ بعض حلقہ ہائے تحقیق میں ہم نے کافی قابل اعتماد اصول اختیار کر لئے ہیں جن سے سائنس اور غیر سائنس میں تمیز ہو سکتی ہے۔ بدقسمتی سے اور میدانوں کی طرح سائنس میں بھی ایک قسم کی عینیت پرستی موجود ہے جو اس سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے

جس پر اوپر اعتراض کیا گیا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ ماہرین عمرانیات بھی بلا تاخیر ویسے ہی واضح اصول پیش کریں جو پیش گوئی کی صلاحیت اور صحت میں ترقی یافتہ سائنسوں کے برابر ہوں۔ تاہم ہمارا موقف یہ ہے کہ ادھورا علم ٹانک ٹوئیے مارتے پھرنے سے بہتر ہے اور سائنس کی شاہراہ بڑی لمبی اور ناہموار ہے۔ نصب العین ہمارے سامنے ضرور ہونے چاہئیں لیکن ہمیں نصب العین اور فریب نظر میں امتیاز کرنا چاہیئے۔

۳۔ مشترک نقطۂ نظر

معاشرتی روابط کے بارے میں ہمارے قبل سائنسی انداز ہائے فکر نے ہماری ثقافت میں ایک بنیادی اور تباہ کن تفریق پیدا کر دی ہے۔ ہمارے معاشرتی حالات جو تشویش ناک ہیں تو اس کی وجہ ٹھیک یہی ہے کہ ہم نے طبیعی دنیا سے اپنے تعلقات میں سائنس کو اختیار کر کے اس کا وسیع اطلاق کیا ہے جان ڈیوی کہتا ہے کہ "یہ تفریق زمانہ حال کی زندگی کے ہر شعبے (مذہبی، معاشی، سیاسی، قانونی اور فنی) پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ اسی لئے میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ موجودہ ثقافت اور متعلقہ زندگی کا بنیادی مسئلہ یہی ہے کہ جہاں اس وقت تفریق ہے وہاں تالیف کی جائے۔ یہ مسئلہ متفقہ حکمت عملی اور طریق کار کے بغیر حل نہیں ہو سکتا"

یہ متفقہ حکمت عملی وہی ہونی چاہیئے جو جدید طبیعیات کی ہے اور اس کا انسانی معاشرے پر، جس میں انسان کے خیالات، احساسات اور "روحانی" خصوصیات شامل ہیں، پورا اطلاق ہونا چاہیئے۔

اس تجویز میں اندازِ فکر کا جو انقلاب مضمر ہے میں اس کی بنیادی نوعیت سے آگاہ ہوں۔ میں اس سے بھی آگاہ ہوں کہ تاریخ انسانی میں سائنسی اندازِ فکر بہت قریب زمانے کا ہے، اس پر ہماری پشت کا بڑا قلیل حصہ عمل پیرا ہے اور یہ بہت لوگوں کے لئے جو بصورت دیگر قابل ستائش ہیں ناموافق ہے۔ جیسا ہم دیکھ چکے ہیں اکثر لوگ فوری اور معجزانہ حلوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ یہ ماننا زیادہ پسند کرتے ہیں کہ ایک نئی سیاسی پارٹی، ایک نیا وزیر یا بالخصوص ایک نیا عالمی ادارہ مطلوبہ حل ہے۔ میں ان میں سے کسی کا بھی مخالف نہیں ہوں نہ ہی میری تجویز یہ ہے کہ ان مفادات سے غفلت برتی جائے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ اکیلے مفید نہیں ہو سکتے جب تک کہ بنیادی علم کو ایک حد تک ترقی نہ دی جائے اور اسے استعمال نہ کیا جائے۔ ایسا علم جو مثلاً انجینئری، جہازرانی اور طب کی بنیاد ہوتا ہے۔ ایک قابلِ ترین اور مخلص ترین لیڈر بھی رہنمائی نہیں کر سکتا جب تک اس کے پاس صحیح راہ دکھانے کے لئے مناسب نقشے اور آلات نہ ہوں۔ معاشرتی سمندروں میں جہازرانی کے یہ نقشے اور آلات ابھی تک نامکمل اور ناقابل اعتماد ہیں۔ اس کے نتائج ہر اخبار کے پہلے صفحہ پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ بعض حلقوں میں اس طریق کار کا جو میں تجویز کر رہا ہوں اس بنا پر تمسخر اڑایا جاتا ہے کہ گو بالآخر یہ صحیح حل ثابت ہوگا مگر مہلت زیست مختصر ہے۔ لیکن کس کی زیست کی؟ مجموعی حیثیت میں

انسانی عمر کا ماضی کم ازکم ایک کروڑ برس ہے اور ممکن ہے کہ اس کا مستقبل اس سے بھی طویل ہو۔ زندگی کے ہر دور میں اس بات کو ذہین اور مہذب انسان کی علامت سمجھا جاتا رہا ہے کہ اس میں پیش نظر صورت حالات سے آگے سوچنے اور منصوبہ بندی کی صلاحیت ہے۔ بہر صورت ہمارے پاس کیا چارہ ہے؟ وہ فوری حل جس کے سب متمنی ہیں خود سائنسی علم کی ترقی اور استعمال پر منحصر ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض معاشرتی مسئلے سائنس کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں اور ہمیں ان مشکلات کے حل میں سائنس ہی مدد دے سکتی ہے۔

میں نے یہ نہیں کہا کہ سائنس تمام زندگی یا تمام علم پر حاوی ہے۔ جیسا ہم آگے چل کر دیکھیں گے "سائنس بمقابل ادب و فنون" کا مروجہ مباحثہ بالکل احمقانہ ہے۔ بظاہر یہ فرض کیا جاتا ہے کہ سائنس اور بالخصوص عمرانیات کی ترقی سے انسان کے ذہنی، فنی اور مذہبی وظائف کو نقصان پہنچنا لازم ہے۔ یہ لغو مفروضہ ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ انسانی علم ایک مقررہ مقدار ہے چنانچہ کسی ایک شعبے میں اضافہ کسی اور شعبے کے نقصان ہی سے ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنس کی ترقی فنون کو بھی آزادی، تقویت اور ترقی عطا کرتی ہے۔ جہاں تک کلاسیکل ادب کا تعلق ہے، جس کے بارے میں بعض حلقوں میں بڑی تشویش پائی جاتی ہے، میری تجویز یہ ہے کہ سائنس کو ادبی رنگ دیا جائے نہ کہ ادبیات کو غیر ادبی بنایا جائے۔ ان مسلم الثبوت تصنیفات

کے لئے جو واقعی اس نام کی مستحق ہیں کوئی خطرہ نہیں۔ البتہ ایسی تصنیفات کا انتخاب ہر لیشت کا اپنا حق ہے کیونکہ وہ اپنے اپنے حلقوں میں اعلیٰ ترین خوبی کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یہ ماننے کی کیا وجہ ہے کہ ایسا وقت بھی آسکتا ہے جب انسان اُن چیزوں کو جنہیں وہ اعلیٰ ترین خوبی کا حامل سمجھتا ہے ترک یا رد کر دے گا ؟

الغرض ہمارے زمانے کی نمایاں خصوصیت ہمارے فکر اور انسانی امور کے متعلق ہمارے رویے میں انتشار اور تناقض ہے ہم نے طبیعی دنیا سے اپنے تعلقات میں ایک متحدہ طریق کار کو ترقی دی ہے جو صحیح نتائج پیدا کرنے میں نمایاں طور پر کامیاب رہا ہے۔ لیکن ہم معاشرتی مسائل کے حل کے لئے ایسے ہی متحدہ طریق کار کی تکمیل میں بُری طرح ناکام رہے ہیں۔ نتیجے کے طور پر ہم اپنے آپ کو عجیب حوصلہ شکن ناکامیوں سے گھرا پاتے ہیں۔ جہاں امراض کے علاجوں کے متعلق شدید اختلاف ہے وہاں علامات پر غیر معمولی اتفاق پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بار بار دہرانے سے وہ فرسودہ ہو چکی ہیں۔ مبلغ، معلّم، معاشرتی کارکن، صحافی، سائنس دان اور مدبر سبھی اس امر کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ سب سے زیادہ خوش حال قوموں میں بھی لاکھوں نفوس دولت کی فراوانی کے باوجود عسرت میں گزر کر رہے ہیں۔ اسی طرح لاکھوں اشخاص قابل علاج امراض سے مرجاتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ قومیں تباہی کے مہلک ترین ہتھیاروں کے ساتھ ایک

دوسری کا بیابانوں، کھیتوں، جنگلوں اور ساتوں سمندروں میں تعاقب کر رہی ہیں اور پکار پکار کر دعویٰ کرتی ہیں کہ ہم اپنی بقا اور ہر اس چیز کے لیے جو زندگی کو قابلِ قدر بناتی ہے لڑ رہی ہیں۔ تو کیا یہ تعجب انگیز ہے کہ ایسے حالات میں اکثر لوگ پوچھیں کہ کیا سائنس اس خطرناک صورتِ حالات میں کچھ کر سکتی ہے؟ اب ہم اس سوال پر غور کرتے ہیں۔

باب ۲

کیا سائنس معاشرتی مسائل حل کرسکتی ہے؟

۱۔ عمرانیات کے راستے میں مبینہ رکاوٹیں

اس کی بڑی وجہ کہ عمرانی علوم کو اب تک پوری اہمیت کیوں نہیں دی گئی غالباً وہ روایتی انداز ہائے فکر ہیں جن کا ہم جائزہ لے چکے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ عمرانی علوم کے متعلق تمام شبہات کی نوعیت یہی ہے۔ کئی سمجھ بوجھ والے اشخاص جن میں امتیازی حیثیت رکھنے والے اور اپنے حلقہ ہائے مطالعہ میں مسلم قابلیت کے مالک سائنس دان شامل ہیں، اس بات کے قائل ہیں کہ طبیعیاتی اور عمرانی علوم میں بعض اختلافات ہیں جو دونوں قسم کے علوم پر یکساں اصولوں کے اطلاق کے مانع ہیں۔ یہاں میں ان لغزشوں کی طرف اشارہ نہیں کر رہا جو طبیعیات، ادب اور فن کی عظیم اور تقریباً عظیم شخصیتوں سے سرزد

ہوتی ہیں جب وہ عمرانی نظام کے متعلق عام طور پر طفلانہ آرا کا اظہار کرتی ہیں۔ میرے ذہن میں دراصل وہ متین طالب علم ہے جس نے اس معاملے پر غور کیا ہے۔

جس غیر ذمہ داری سے آج کل "سائنس" اور "سائنسی منہاج" کے الفاظ کا استعمال ہو رہا ہے اس پر بعض ممتاز سائنس دانوں نے بجا طور پر تشویش کا اظہار کیا ہے اور یہ شبہ ظاہر کیا ہے کہ ایک واحد "سائنسی منہاج" ہے بھی یا نہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ مختلف سائنسوں اور مختلف سائنس دانوں کے منہاج مختلف ہوتے ہیں، یہاں تک کہ وہ انفرادی سائنس دانوں سے مخصوص ہوتے ہیں۔ یہ لوگ علوم اور خاص کر عمرانی علوم کی تحقیق میں کوتاہیوں کے متعلق جو کچھ کہتے ہیں، میں اس کی تردید نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن مجھے یہ کہنا مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے کہ منطق اور منہاج کے کوئی ایسے قواعد ہیں جو سائنس دانوں سے مخصوص ہیں۔ اگر "سائنسی منہاج" یا "منہاجوں" سے مختلف علوم کے طریقہ ہائے کار اور لوازمات مراد ہوں تو سائنسی منہاجوں کے تنوع میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ آخر بعض سائنسوں میں خردبین استعمال ہوتی ہے تو بعض میں دوربین۔ تاہم تخمینہ کرنے، تلازم ڈھونڈنے اور منطقی استخراج کے ایسے عام اصول اور منہاج بھی ہیں جنہیں تقریباً سب سائنس دان قبول کرتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہر سائنس دان کے ذہن میں کوئی نہ کوئی معیار ضرور ہوتے ہیں جن کے حوالے سے وہ اپنی اور دوسروں کی کارگزاری کو "سائنسی"

یا غیر سائنسی قرار دیتے ہیں۔ جب میں اس کتاب میں "سائنسی منہاج" کا ذکر کرتا ہوں تو میرے ذہن میں یہی معیار ہوتے ہیں۔ (ان کا زیادہ تفصیلی بیان صفحہ ۱۱۷ — ۱۱۸ پر دیکھئے) اس اثنا میں میں چند ایسے مخصوص اعتراضات سے بحث کروں گا جن کے مطابق ماہرین عمرانیات کو ماہرین سائنس کے زمرے میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔

مثلاً ایک ممتاز سائنس دان نے بڑی شد و مد سے کہا ہے کہ طبیعیاتی اور عمرانی علوم میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ موخرالذکر میں "محقق اپنے موادِ تحقیق کے اندر ہوتا ہے باہر نہیں۔" یہ بات اس قدر بدیہی خیال کی جاتی ہے کہ اس کی تشریح کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن غور کرنے سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کی حیثیت ایک استعارے سے زیادہ نہیں جو جانبدارانہ مشاہدات اور توجیہات کے خطرے سے آگاہ کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہو۔ ایسا خطرہ جو ہر علم میں موجود رہتا ہے اور جس پر صرف اس طرح قابو پایا جا سکتا ہے کہ ایسے منہاج اور آلے کام میں لائے جائیں جو ہر میدان میں سائنسی تربیت کا جزو ہوتے ہیں۔

جب کوئی ماہر انسانیات ایک دور دراز، قبل خواندگی دور کے قبیلے کے پاس اس کے معاشرتی طرز عمل کا مطالعہ کرنے جاتا ہے تو وہ کس طرح اپنے مواد کے زیادہ اندر ہوتا ہے بہ نسبت اس سائنس دان کے جو انسان نما بندروں، اود بلاؤں، سفید چوہوں کا مطالعہ کرتا ہے یا جو نباتات کی ماحولیات کا جائزہ لیتا ہے یا جو موسم، مدوجزر یا نظام شمسی

کی تحقیق کرتا ہے؛ جب کوئی ماہر حیاتیات اپنے جسم کا مطالعہ کرتا ہے یا اپنی تپش ناپتا ہے تو وہ بظاہر زیر مطالعہ مظاہر کے بہت کچھ اندر ہوتا ہے یا ان کا ایک حصہ۔ اس سلسلۂ مشاہدات میں وہ کون سا مقام ہے جہاں مواد کے باہر سے اندر کی طرف پر اسرار عبور ہو جاتا ہے؛ نہ ہی اس دعوے کے ثبوت کے لئے کسی دور دراز سرزمین میں جانا اور غیر متمدن قوموں کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ میں بعض معاشرتی حوادث کے متعلق جو اسی گروہ میں رونما ہو رہے ہیں جس کا میں ایک فرد ہوں اتنا ہی معروضی بیان دے سکتا ہوں جتنا کیمیاتی حوادث کے متعلق۔ دونوں ہی میں زیر مطالعہ حوادث کی صحیح تعبیر اور مشاہدے کی مشکلات موجود ہیں۔

مشاہدے کو ممکن حد تک تیز کرنے، اس کی تنقیح کرنے اور اس کی صحیح توجیہ کرنے کے لئے آلات کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ آلات اور مہارتیں کسی بھی میدان مطالعہ میں بنی بنائی موجود نہیں ہوتیں۔ انہیں اختراع کرنا پڑتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بہت سی معاشرتی تحقیق میں یہ ابھی تک بالکل ابتدائی ہوں اور ان کی کل کائنات محض ایک پنسل، ایک جدول، چند معیاری سوالات یا کسی ملاقات کی روداد ہو۔ لیکن ہمارے پاس متحرک تصویریں لینے اور آواز محفوظ کرنے کا کیمرہ بھی تو ہے جس کی بدولت معاشرتی طرز عمل کا بھی اسی صحت کے ساتھ مشاہدہ کیا جا سکتا ہے جیسے کسی اور طبیعی مظہر کا۔ جب میں ان آلات کو استعمال میں لاتا ہوں تو میں اپنے مواد کے اتنا ہی "اندر" ہوتا ہوں جتنا کہ گرہن کا فوٹو لیتے

وقت ۔

جن اکائیوں اور آلات کی مدد سے مشاہدہ مرتب کیا جاتا ہے ان کی ایجاد بھی تو سائنسی سرگرمی کا ایک پہلو ہے ۔ (طبیعیات کے مظاہر میں حرارت اور حرارہ پیما بنے بنائے تو نہیں مل گئے تھے) انہیں زیر غور مظاہر پر اطلاق کے لئے اختراع کرنا پڑتا ہے ، اُسی طرح جیسے آمدنی یا معیار زندگی کی اکائیاں اور انہیں ناپنے کے پیمانے اختراع کرنے پڑتے ہیں ۔ میں ان مشکلات کا استخفاف نہیں کر رہا ہوں جو ایسی اکائیوں یا سائنسی مشاہدے کے لئے موزوں آلات کے اختراع کرنے میں پیش آتی ہیں ۔ نہ ہی ہمیں اپنے مشاہدات کی تعبیر کی مشکلات کا استخفاف کرنا چاہیئے لیکن یہاں بھی ہمارے پاس وہی منطق ، شماریات اور سائنسی منہاج کے قواعد ہیں جن کا اطلاق ہم طبیعیاتی حوادث کے مشاہدوں پر کرتے ہیں ۔

لوگ عام طور پر سائنس اور لبارٹریوں اور منضبط تجربات کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں ۔ غالباً سائنس کا لفظ ہی عام لوگوں کے ذہنوں میں ایک ایسے شخص کا تصور پیدا کر دیتا ہے جو سفید کوٹ میں ملبوس ایک امتحانی نلی کو غور سے دیکھ رہا ہے ۔ چنانچہ عمرانیات کے راستے میں ایک اور ناقابل عبور رکاوٹ کا ذکر کیا جاتا ہے ۔ یعنی معاشرے کا ایک ٹکڑا امتحانی نلی میں کیسے ڈالا جا سکتا ہے ؟

بعض سائنسوں کی ترقی میں لبارٹری کے تجربات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن مختلف سائنسوں کے بارے میں لبارٹری کے

انقباط کا سوال مختلف ہوتا ہے۔ نظام شمسی کو کبھی کسی لیبارٹری میں نہیں لایا گیا۔ فلکیاتی لیبارٹریوں میں اس نظام کے فلکیاتی پہلوؤں کے عمدہ میکانکی نمونے اور اس کے مشاہدے کے لئے اعلیٰ آلات موجود نہیں ہوتے۔ اس میں کلام نہیں کہ ہر سائنس کو انہیں ترقی دینی چاہیئے۔ لیکن اس سے زیادہ کرنا محض سہولت اور میکانکی اختراع کا سوال ہے۔ شماریاتی آلے جن سے زیادہ زیادہ متغیروں کا مشاہدہ ہوسکے۔ اب عام طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔ بہر حال عمرانی علوم میں بھی صحیح تجربے ناممکن نہیں ہیں۔ اس موضوع میں دلچسپی رکھنے والے قاری کے لئے متعلقہ تحریروں کا مطالعہ کرنا مفید ثابت ہوگا۔

۲۔ محرکات کے بارے میں

عمرانی مظاہر کے طبیعی سائنس بننے کے راستے میں ایک اور ناقابل عبور رکاوٹ، یہ بتائی جاتی ہے کہ ان میں ایک عجیب اور پُراسرار چیز ہوتی ہے، یعنی محرکات۔ کہا جاتا ہے کہ جب ہم انسانی محرکات کی تحقیق شروع کرتے ہیں تو اس میں محقق کے اپنے محرکات بھی شامل ہو جاتے ہیں۔

محرکات کے معنی کیا ہیں؟ اس لفظ کا اطلاق ان حالات پر ہوتا ہے جن سے کسی واقعے کا منسوب کرنا ہم "قرین قیاس" سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جب ہم کسی عمل سے محرک منسوب کرتے ہیں تو وہ اُس حرالجاتی نظام سے متعلق ہوتا ہے، جسے ہم معقول خیال کرتے ہیں۔ ایک ہی واقعہ معاشی

محرکات، ایڈیپس گرہ یا قرانِ انجم سے منسوب کیا جا سکتا ہے اگر مشاہد معاشیاتی جبر کا قائل، فرائڈ کا پیرو یا منجم ہو۔ ایک سائنس دان کے نزدیک کسی کنکر کے لڑھکنے یا کسی لڑکے کے اپنے باپ کو قتل کرنے کے محرکات محض ان حالات کا پورا مجموعہ ہیں جو اس واقعہ میں منتج ہوئے۔ یہ حالات دونوں صورتوں میں سائنسی تحقیق کا موضوع بن سکتے ہیں۔

البتہ ان دونوں صورتوں کے حالات بہت ہی مختلف نوعیت کے ہوں گے۔ لڑکے کے معاملے میں "ذہنی" اور جذباتی عناصر کارفرما ہوں گے جو انتہائی باریکی (پیچیدگی، غیر محسوسیت، موضوعیت) کے حامل ہیں۔ لیکن اگر ہم یہ موقف اختیار کرنے کو تیار نہیں کہ ایسے مظاہر کے لئے سائنس کی بجائے کوئی اور منہاج موزوں ہوں گے تو ہمیں اس سے مفر نہیں کہ ہم ایسی تحقیق کے لئے مناسب سائنسی طریق کار کی اصلاح اور نشوونما کریں۔ اس سمت میں ہماری پیش قدمی ابھی تک درخورِ اعتنا نہیں۔ دماغی معالجے اور جرمیات کے طریقہ ہائے کار، جن میں دروغ شناس آلات اور دماغی امواج کی مشینیں شامل ہیں، اس بات کے شاہد ہیں کہ انسانی محرکات بھی سائنسی تحقیق کی دسترس سے باہر نہیں۔

جہاں تک محقق کے اپنے محرکات شامل ہو جانے کا سوال ہے تو یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی سائنسی مسئلے کے بارے میں باقاعدہ تربیت یافتہ سائنس دان کا واحد محرک یہی ہوتا ہے کہ وہ اسے سائنس کے مقررکردہ اصولوں کے مطابق حل کرے۔ الغرض کسی سائنسی مسئلے کے

بارے میں ماہر عمرانیات اور ماہر طبیعیات کے محرکات بعینہٖ یکساں ہوتے ہیں۔ محرک یہ ہوتا ہے کہ ایک ایسا حل تلاش کیا جائے جو سائنسی حل کے تقاضوں کو پورا کرے۔ یہ امر کہ ماہر عمرانیات ہمیشہ کسی معاشرتی گروہ کا فرد ہوتا ہے اس کے معروضی مطالعے میں اس سے زیادہ مزاحم نہیں ہوتا جتنا یہ امر کہ وہ اُس طبیعی کائنات کا بھی ایک جزو ہے جس کا وہ مطالعہ کرتا ہے۔ شعوری یا غیر شعوری خطا، بددیانتی اور ذاتی رجحان ہر قسم کے طبیعی یا معاشرتی مشاہدے میں موجود ہو سکتے ہیں۔ صحیح سائنسی تربیت اخلاقیات اور صناعیات دونوں کی تعلیم دیتی ہے اور ایسے اصلاحی آلات کا استعمال سکھاتی ہے جن سے ان خطاؤں کو جو ہمارے حواس سے سرزد ہوتی ہیں کم سے کم کیا جا سکے۔

وہ لوگ جو اس خیال سے کبیدہ خاطر ہوتے ہیں کہ سائنسی منہاج محرکات کی تشخیص کی اہلیت نہیں رکھتے انہیں چاہیئے کہ وہ اُن منہاجوں پر غور کریں جن سے آج کل فی الواقعہ محرکات کی تشخیص کی جاتی ہے۔ ایک عام منہاج یہ ہے کہ بارہ سیدھے سادے آدمیوں (کسانوں، مینبوں، فروشندوں، یا جو کوئی بھی مل جائے) کو اکٹھا کر کے انہیں ایک وقوعے کے حالات کے متعلق جمع کردہ شہادت کا ہدف بنایا جاتا ہے۔ جس کے بعد منصف انہیں حکم دیتا ہے کہ وہ فیصلہ کریں کہ واردات سے بعینہٖ تعلق رکھنے والے شخص کا "محرک" فریب آمیز، مجرمانہ، معاندانہ وغیرہ تھا یا نہیں۔ اور یہ لائق فائق شہری اس وظیفے سے کس طرح عہدہ برآ ہوتے

ہیں؛ وہ اس معاملے کو مختلف طریقوں سے پرکھتے ہیں۔ مثلاً خود اپنی زندگی کے تجربات کی روشنی میں، اُس تجربے سے مقابلہ کر کے جو انھیں انسانی کردار کے اوٹ پٹانگ اور غیر منظم مشاہدے سے حاصل ہوا ہے، اور اُس علم کی مدد سے جو انھوں نے عام روایات، انجیل اور شائد تاریخ اور دماغی معالجے کی کتابوں سے اخذ کیا ہے۔ وہ فراہم کردہ شہادت کو اس پس منظر کے سامنے رکھتے ہیں اور اس بنیاد پر "صحیح" محرک کا فیصلہ کرتے ہیں۔ کسے معلوم نہیں کہ یہ طریق کار بڑا ناقص ہے؟ اور یہ کہنے میں مبالغہ نہیں کہ ایسے کام میں باقاعدہ تربیت یافتہ سائنس دان بہت کم غلطیاں کریں گے۔ لیکن ہم انسانی محرکات کی تشخیص کے بارے میں جیوری کی قابلیت کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ ہم اس پر شہریوں کی زندگی اور موت تک کے لئے انحصار کرتے ہیں۔ انسانی محرکات کی تشخیص کے مروجہ منہاجوں کا بھونڈا پن ہی اس اہم مسئلے کے بارے میں سائنس سے رجوع کرنے کی وزنی دلیل ہے۔

۳۔ سائنس اور آلات

اُن انتہائی جانبدارانہ معاشرتی اور سیاسی تجاویز کے پیشِ نظر جو آج کل سائنس کے نام پر پیش کی جاتی ہیں یہ بات تعجب انگیز نہیں اگر اکثر لوگ یہ نتیجہ نکالیں کہ معاشرتی تحقیق میں محقق کا رجحان تمام نتائج پر اثر انداز ہوتا ہے کیا مذکورہ بالا اصلاحی آلات فی الواقع تیار ہو چکے ہیں؟

آج کل عمرانی علوم میں بیسیوں آلے مستعمل ہیں جو ہمارے حواس کے رجحان اور مختلف مشاہدہ کرنے والوں کے میلان کا کھوج لگانے۔ اسے

کم سے کم کرتے اور ناپتے ہیں۔کیا ہمارے پاس عمرانیاتی نتائج کی ایسی مثالیں ہیں جو محقق کی پسند، ناپسند اور گروہی تعلقات سے متاثر ہیں؟ اس کا ہر شخص کو خود جواب دینا چاہیئے۔کیا کوئی "سائنسی" رائے شماری بلالحاظ شمارندہ کے اپنے جذبات کے، نتیجۂ انتخاب کی پیش گوئی کرسکتی ہے؟ کیا شادیوں، طلاقوں، سکول کے داخلوں یا کالج کی کامیابیوں کی تعداد کی پیشگوئی پیشگو کی اپنی ازدواجی یا تعلیمی حیثیت یا امیدوں سے متاثر نہیں ہوتی؟ جہاں تک باقاعدہ تربیت یافتہ سائنس دان کا تعلق ہے ذاتی خصوصیات اور خواہشات اس کی پیش گوئیوں پر کسی طرح اثرانداز نہیں ہوتیں۔ مثلاً بیماری آبادی، تعداد مزدوراں اور آمدنی کے میلانات سے متعلق محکمہ رائے شماری کے اعداد وشمار اور تعمیمات پر غور کیجئے۔کیا یہ نتائج اشتراکی، سرمایہ دارانہ یا فاشستی ہوتے ہیں؟ اس سوال میں اتنی ہی معقولیت ہے جتنی اس میں کہ کیا کشش ثقل کا کلیہ عیسائی، اسلامی یا ہندو ہے؟

ظاہر ہے کہ عمرانی علوم کی موجودہ حیثیت اور کارناموں کا جامع جائزہ پیش نظر تصنیف کی حدود سے باہر ہے۔ گو میری رائے میں یہ امر ناقابل تردید ہے کہ موجودہ صدی کے دوران میں عمرانی علوم نے تمام سابق تاریخ سے زیادہ ترقی کی ہے یہ دعوے کرنا احمقانہ ہوگا کہ اس ترقی کا اثر ہمارے معاشرتی امور کے انصرام میں بھی دکھائی دیتا ہے۔کم وبیش قابلِ اعتماد سائنسی معلومات پہلے سے بہت زیادہ موجود ہیں لیکن ظاہر ہے کہ سائنسی اندازِ فکر

نے بہت کم ترقی کی ہے۔ عملاً کوئی بھی آج کل کے معاشرتی مسائل پر غیر جانبدارانہ سائنسی نقطۂ نظر سے بحث نہیں کرتا۔ یہ خیال کئی ایسے لوگوں کے ذہنوں میں بھی جو ماہرین عمرانیات گردانے جاتے ہیں پیدا نہیں ہوا کہ اگر یہ مسائل حل ہو سکتے ہیں تو صرف اس طرح کہ دقیق پیما آلات کا استعمال ایسے ہاتھوں میں ہونا چاہیئے جو خوف یا محبت سے لرزیں نہیں۔ ایسے نام نہاد ماہرین عمرانیات عوام کے شوروغل میں صحافی اور بازاری خطیب کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں۔ ان کی نام نہاد عالمانہ تصانیف تحسین و نفرین اور لفظی جھاڑ پھونک سے اٹی ہوتی ہیں جن کی سائنسی منہاج میں ہرگز کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ یہ غضب ناک لوگ نہ صرف موجودہ زمانے کے عظیم ماہرین عمرانیات مانے جاتے ہیں بلکہ اکثر اوقات ایسے حقیقی سائنس دانوں کی سرپرستی کی جسارت کرتے ہیں جو سائنس اور ان آلات کی تعمیر میں مگن رہتے ہیں جن کے ذریعے مشکل مسائل کا حل دریافت کیا جا سکے۔

طرح طرح کی مشتبہ سیاسی تحریکات، لیڈروں کی ذاتی زندگی اور اخلاق اور جمہوریت پر کتابوں کے سیلاب سے سائنسی فضا مکدر ہو چکی ہے لیکن اس اندھیرے میں بھی ٹھوس کام ہو رہا ہے۔ لوگ محنت سے انسانی بیوہار کے متعلق کوائف جمع کر رہے ہیں۔ ایسے کوائف جو وقت آنے پر ایسے کلیے کی بنیاد بن سکیں گے جو اس سے بیشتر ممکن نہیں ہوا۔ بعض اشخاص متعدد انسانی گروہوں اور بیوہار کی صورتوں کی درجہ بندی کے خاموش لیکن اہم کام میں مصروف ہیں جو ان کی واضح تشریح اور تعمیم کی طرف پہلا قدم ہے۔

بعض لوگ پیدائش و اموات کے اور دوسرے جدول تیار کرنے میں رہنمائی کر رہے ہیں۔ ان جدولوں سے نہ صرف پیدائشوں، موتوں، شادیوں اور طلاقوں کی پیش گوئی کی جا سکتی ہے بلکہ ایسے سوالات کا جواب بھی مل سکتا ہے کہ آیا شادیاں کامیاب ہوں گی یا نہیں ؟ یا قیدیوں کو آزمائشی طور پر رہا کر دینا یا انہیں واپسی کا وعدہ کرنے پر جیل سے نکلنے دینا کس حد تک کامیاب ہوگا ؟ یا دیگر "انسانی" امکانات کے سوالات۔ آبادیوں کے بیوہار اور معاشرتی خصوصیات کے متعلق بہت سی قیمتی معلومات اور تعمیمات مہیا کی جا چکی ہیں۔ مثلاً دولت کی تقسیم، پیشے، نقل مکانی، ذہانت اور مختلف حالات جن کے ساتھ یہ خصوصیات بدلتی رہتی ہیں۔ گزشتہ چند سالوں میں اہم آلات ایجاد کئے گئے ہیں جن سے مذہب، معاشی حیثیت اور افراد کے باہمی تعلقات کے کئی مظاہر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

در اصل معاشرتی مظاہر کے زیادہ صحیح اور دقیق مشاہدے اور قلم بندی کے آلات کی ایجاد اور ان کی تکمیل عمرانی علوم کی اہم ترین ترقیوں میں شمار ہونی چاہیئے۔ ان آلات کے نقائص گنوانا اتنا ہی آسان ہے جتنا شروع کی خوردبینوں اور دوربینوں کی کوتاہیاں بتانا آسان تھا۔ لیکن ان ابتدائی اور خاموش محنت کی صبر آزما صدیوں کے بغیر جراثیمیات ایسے علوم معرضِ وجود میں نہیں آ سکتے تھے۔

علاوہ ازیں ایسے اشخاص بھی ہیں، اور ممکن ہے کہ وہ اہم ترین ثابت ہوں، جو مظاہر کے علاماتی اظہار کے طریقے ایجاد کر رہے ہیں۔ ریاضیات کے نئے

تصرفات جن سے ناقابلِ فہم گتھیاں بھی سلجھ جاتی ہیں نہایت ہی اہم ہیں لیکن یہ
عام نمائش کے لئے موزوں نہیں۔لائب نٹس، فیریڈے اور ہرشل کا کام ان
کے زمانے کی ہردلعزیز سائنس نہ بن سکا۔لیکن یہ انہی کے حیرت انگیز
حسابوں اور انہی کی ایجاد کردہ علامتوں کی بدولت ہے کہ آج انسان دنیا کے
گرد اڑتا پھرتا ہے اور اپنی تقریریں ریڈیو کے ذریعے نشر کرتا ہے۔یہ
بات اُن "مصنفوں" کو نہ بھولنی چاہیئے جو شکایت کرتے ہیں کہ عمرانیات
دان ایسی ناقابلِ فہم اصطلاحیں اور محرمانہ علامات اختیار کر رہے ہیں جو مروجہ
مقبولِ عام کتابوں میں نہیں ملتیں۔

اگر میں ماہرین عمرانیات کی اِن گمنام اور خاموش کوششوں سے بحث
کرتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں انہیں انجام کار زیادہ اہمیت کا حامل
سمجھتا ہوں بہ نسبت اُن نمایاں ہم عصر کارگزاریوں کے جن کا علم عام ہے۔
میں اِن زیادہ بدیہی کارگزاریوں کو نظرانداز نہیں کر رہا اور نہ ہی ان کا استخفاف
کر رہا ہوں۔ہمارے زمانے میں زیادہ روشن خیال تعلیم، معاشرتی کام
اور تعزیریات کی بدولت بچوں، غریبوں اور بدنصیبوں سے زیادہ انسانیت
کا سلوک ہو رہا ہے۔یہ ترقی پذیر نفسیات اور عمرانیات کا مرہونِ منت ہے۔
میں یہ خوب جانتا ہوں کہ جب کبھی جنگ چھڑ جائے یا سرد بازاری رونما
ہو تو صحافی اور مبلغ ماہرین سیاسیات اور معاشیات کو موردِ الزام ٹھہراتے
ہیں کہ وہ ان عظیم حادثات کی پیش گوئی نہ کر سکے یا انہیں روک نہ سکے۔حقیقت
یہ ہے کہ پہلی عالمی جنگ سے لے کر اب تک کے واقعات کی کئی ماہرین

عمرانیات نے بڑی صحت سے پیش گوئی کی تھی۔ رہا یہ سوال کہ اس کے متعلق کچھ نہ کیا گیا تو یہ ماہرین عمرانیات کی ذمہ داری نہیں ہے۔ عملی تدابیر اختیار کرنا معاشرے کے تمام ارکان کی ذمہ داری ہے بشمول سائنس دالوں کے اور بالخصوص ان کے جو عوامی تعلیم، عوامی قیادت اور عملی پروگراموں میں خصوصی مہارت رکھتے ہیں۔

عمرانی علوم کی گزشتہ اور موجودہ کارگزاریوں پر تبصرہ کرنا میرا بنیادی مقصد نہیں ہے۔ چند ایسی کارگزاریوں پر اگلے باب میں بحث کی جائے گی۔ یہاں مجھے زیادہ تر عمرانی علوم کے متوقع مستقبل سے سروکار ہے۔ اگر میں یہ مان بھی لوں کہ عمرانیات دان اپنے علم کے حجری دور میں پتھر تراش رہے ہیں تو میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں دیکھتا کہ ہم بھی اُسی ناہموار اور کٹھن راستے پر گامزن ہوں جو دوسرے علوم طے کر چکے ہیں۔ اُن جیسی کامیابی حاصل کرنا بڑی دور کی بات معلوم ہوتی ہے اور اس کے لئے جو محنت و مشقت درکار ہے وہ ہمت شکن دکھائی دیتی ہے۔ لیکن کیا یہ منزلِ مقصود ناقابل حصول ہے؟ فرض کیجئے کہ آج سے چار سو سال پیشتر کسی نے طبیعیاتی علوم کے مستقبل پر تقریر کی تھی اور فرض کیجئے کہ اُس نے ان کی موجودہ کارگزاریوں کا صرف تھوڑا سا حصہ تصور کیا تھا تو اس کے سامعین کا، گو وہ دانا و بینا ہی ہوتے، کیا ردِّ عمل ہوتا جب ایسی پیشگوئیاں کی جاتیں کہ لوگ سمندروں کے پار اڑیں گے اور باتیں کریں گے، بعید از قیاس دنیائیں دیکھیں گے اور جدید انجینری

اور جراحی کے محیر العقول کرشمے کر دکھائیں گے ؛ میرے خیال میں عمرانیات اور اس کے عمل استعمال کی رسیدگی کا جو ذکر میں نے کیا ہے وہ اتنا ہی بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے جتنا ہمارے چاند سویا صرف ایک سو سال پہلے کے ماہر طبیعیات کی پیش گوئیاں معلوم ہوتیں ۔

اب وہ دور ختم ہو رہا ہے جب عمرانیات کی ٹھوس کارگزاریوں اور اس کی آئندہ توقعات کو ایک طنز آمیز تبسم سے یہ کہہ کر ٹال دیا جائے کہ بدقسمتی سے یہ علم انسان کی اہم ترین خصوصیت یعنی " انسانیت " کو نظر انداز کرتا ہے ۔ یہ " انسانیت " کا تصور اتنا ہی پراسرار اور فہم و ادراک سے بالاتر معلوم ہوتا ہے جتنا کہ روح یا دوسرے روحیاتی مظاہر ۔ بہرصورت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نوعیت پر کوئی بھی مزید روشنی نہیں ڈال سکتا ۔ یہ خیال کہ ایسی خصوصیت موجود ہے خود بے دلیل ہے تحقیق کا جن سے پتا چلتا ہے وہ تو بہت سی انسانی خصوصیات ہیں مثلاً انسانوں کی محبتیں ، نفرتیں ، رقابتیں ، تشویشیں ، امیدیں اور آرزوئیں ان کے متعلق ہم جو کچھ جانتے ہیں وہ انسانی بیوہار کے مشاہدے سے ہے اور ان کے متعلق جو مزید علم ہمارے پاس ہونا چاہیئے یا جو ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ بھی صرف اسی راستے سے حاصل ہو سکتا ہے کسی اور طریقے سے نہیں ۔ دیگر مظاہر کی بہ نسبت جو ابھی سنجیدہ سائنسی مطالعے کا موضوع نہیں بنے انسانی خصائص کچھ زیادہ پُراسرار نہیں ہیں ۔ بہ ظاہر ہے کہ وہ کاروبار اور پیشے جن کے مفادات ظلمت پسندی ، رازپسندی

اور جہالت سے وابستہ ہیں سائنس کو اس میدان میں ترقی کرنے کی کوشش سے روکیں گے جیسے وہ اور میدانوں میں کر چکے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان کی کوششیں رائیگاں جائیں گی۔ لوگوں کے تخیل پر سائنس کی گرفت اتنی مضبوط ہو چکی ہے کہ وہ اس پر اسرار انسانی خصوصیت کی تشریح کے بارے میں بھی اس طاقتور آلے سے مدد لینے پر اصرار کریں گے۔ اُس وقت معلوم ہوگا کہ "اہم ترین انسانی خصوصیت" دراصل کوئی خصوصیت نہیں بلکہ محض ایک مبہم سا لفظ ہے جس کا اطلاق کئی طرح کے بیوہار پر ہوتا ہے۔ عمرانیات والوں نے اپنی کاہلی یا لاعلمی کے باعث بیوہار کی اس بوقلمونی کا ابھی تک مطالعہ نہیں کیا اور نہ ہی انہوں نے ایسا کرنے کے لئے وہ منہاج اختیار کئے ہیں جن کے استعمال سے دوسرے مظاہر قدرت کی توضیح ہو گئی ہے۔

اب تک ہمارے پاس جرأت اور عمرانیات کے صحیح مقصد کی بصیرت کا فقدان رہا ہے۔ فی الحال اس میدان میں تحقیق سے سطحی تدارکوں کی جستجو اور کاروباری رہنمائی مقصود ہے۔ ہر شخص سیاق، مردم شماری اور حبشی آبادی کے حالات کے مطالعے کی اہمیت تسلیم کرتا ہے۔ لیکن تحقیق کی بعض قسمیں ایسی ہیں جو اتنی بدیہی نہیں مگر جو بہر حال سائنس کی ترقی کے لئے لازمی ہیں۔

کیا ہم یہ تسلیم کریں یا نہیں کہ ہم انسانی بیوہار کے ایسے کلیے مرتب کر سکتے ہیں جو کشش ثقل، حرحرکیات اور حیاتیمیات کے کلیوں کے

ہم پلہ ہیں؟ یہ موخرالذکر کلیے بذات خود انجینئری کے کرشمے یا امراض کا علاج نہیں کرتے۔ تاہم وہ ایک ایسا علم ہیں جو ناگزیر ہے۔ ہماری بحث ایک اہم نقطۂ نظر سے گھاٹے میں ہے۔ یعنی ہم پیشتر بیان کردہ طبیعیاتی کلیات کے مقابلے میں عمرانی منہاج کے کلیات پیش نہیں کر سکے۔ لیکن اس کے باوجود ہم نے اس سمت میں کافی ترقی کی ہے۔

۴۔ سائنس اور "اقدار"

آخر میں ہم طبیعیاتی اور عمرانی علوم میں اس اختلاف کا ذکر کرتے ہیں جو اکثر اشخاص کے نزدیک جن میں سائنس دان بھی شامل ہیں، اہم ترین اختلاف ہے۔ ہکسلی کے مطابق "کسی ایسے نظام کو سمجھنا یا اس کی تشریح کرنا جس میں اقدار شامل ہوں اُن اقدار کے کسی قدر ادراک کے بغیر ناممکن ہے"۔ اور آگے چل کر وہ کہتا ہے کہ "اقدار طبیعی سائنس کی حدود سے عمداً خارج کر دی جاتی ہیں"۔ اقدار پر جو آج کل بحثیں ہو رہی ہیں اور جس طرح ان کی سائنس سے ناموافقت دکھائی جا رہی ہے ژولیدہ خیالی کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی۔ ہم اوپر جو کچھ محرکات کے متعلق کہہ گئے ہیں وہ اقدار پر بھی اسی طرح صادق آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی بیوہار کے استخراجات ہیں۔ یعنی جب کسی شے کے متعلق ہمارا بیوہار یہ ہوتا ہے کہ ہم اسے برقرار رکھنا چاہتے ہیں یا اس میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ وہ شے قدر" رکھتی "ہے یا وہ قدر" ہے"۔ معاشی اسباب اور خدمات، سیاسی منصب، رفیق حیات، تعلیمی سند، شہرت، پاکئ ضمیر،

الغرض ہر چیز قدر ہو سکتی ہے۔ چونکہ اقدار بیوہار کے تجربی طور پر مشاہدہ پذیر مظاہر ہوتی ہیں ان کا ہم انہی طریقوں سے مطالعہ کر سکتے ہیں جنھیں ہم باقی بیوہار کے مطالعے میں استعمال کرتے ہیں۔

در اصل ہر شخص دوسروں کی اقدار کے مطالعے میں کم و بیش باقاعدگی سے مصروف رہتا ہے۔ کسی گروہ میں تسلی بخش زندگی بسر کرنے کے لئے یہ نہایت ضروری ہے۔ جس قدر جلد ممکن ہو ہم اپنے ہمسایوں کی اقدار معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم انہیں کس طرح معلوم کر سکتے ہیں؟ ان کے عام بیوہار اور لفظی بیوہار کے مشاہدے سے۔ ہم ان کے متعلق دوسرے لوگوں کی رائے پر غور کرتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کیسے خرچ کرتے ہیں، کس کو ووٹ دیتے ہیں، آیا وہ گرجا جاتے ہیں یا نہیں وغیرہ وغیرہ۔ زیادہ رسمی اور سائنسی سطح پر اشخاص اور مختلف مسائل کے متعلق رائے شماری کرائی جاتی ہے جس سے بڑے گروہوں کی اقدار کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً عرصے سے ماہرین معاشیات لوگوں کی بعض اقدار کا اشیائے صرف کی قیمتوں کے ذریعے مطالعہ کر رہے ہیں۔

اس کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ اقدار کا بھی اُسی معروضیت سے کیوں نہ مطالعہ کیا جائے جیسا کہ اور مظاہر کا کیونکہ وہ بھی تو بیوہار کا جزو لاینفک ہیں۔ وہ حالات جن کے تحت بعض اقدار پیدا ہوتی ہیں اور بعض اقدار کے خاص حالات میں اثرات ٹھیک وہ موضوع ہیں جس کا عمرانیات کو مطالعہ کرنا چاہیئے اور جو وہ کر بھی رہی ہے۔ باقی

تمام بیوہار کی طرح ان اقدار کا بھی سائنسی منہاج کے مسلمہ اصولوں کے تحت مشاہدہ، درجہ بندی اور تشریح کرنی چاہیئے۔

تو کیا وجہ ہے کہ عمرانی علوم میں اقدار کے مسئلے کو یکتا اور لاینحل سمجھا جاتا ہے؟

اس کی بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اوروں کی طرح ماہرین عمرانیات بھی مذہب، فنون، سیاست اور معاشیات کے متعلق واضح آرا رکھتے ہیں۔ یعنی اور چیزوں کی طرح ان میں بھی اُن کی پسند اور ناپسند ہوتی ہے ان ترجیحات کے نتیجے میں ماہرین طبیعیات اور عمرانیات دونوں دوسرے شہریوں کے ساتھ شامل ہوجاتے ہیں اور بااثر گروہ بنا لیتے ہیں تاکہ وہ اپنے مفادات کو ترقی دے سکیں۔ یہ مفادات پیشہ، محنت، سرمایہ، جمہوریت مذہب وغیرہ ہوتے ہیں۔ ایسا کرنا ہر شہری کا حق ہے اور کوئی سائنسی یا دیوانی قانون ایسا نہیں جو سائنس دانوں کو ایسے حقوق ترک کرنے پر مجبور کرے جو جماعت کے دوسرے ارکان کو حاصل ہیں۔

اقدار کے متعلق جو خلط مبحث ہے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ سائنس دان اور عوام دونوں اکثر اوقات فرض کر لیتے ہیں کہ جب سائنس دان گروہی سرگرمی میں شامل ہوجاتے ہیں تو یہ سرگرمی کسی نہ کسی طرح سائنس یا سائنسی سرگرمی بن جاتی ہے۔ یہ نہایت ہی خطرناک مغالطہ ہے۔ اس معاملے کے متعلق عوام کی پریشان خیالی شاید تعجب انگیز نہیں کیونکہ ان پر یہ ہمیشہ واضح نہیں ہوتا کہ آیا سائنس دان کسی سائنسی نتیجے کا اظہار کر رہا

ہے یا ذاتی پسند کا۔ لیکن اگر سائنس دان خود ہی اس میں تمیز نہ کریں کہ وہ بحیثیت سائنس دانوں کے کیا جانتے اور کہتے ہیں اور مذہب، اخلاق اور عوامی پالیسی کے متعلق ان کی پسند اور ناپسند کیا ہے تو یہ ناقابل معافی ہے۔ اپنے آپ کو ایسا سائنس دان ظاہر کرنا جو سائنسی نتیجوں کا اعلان کر رہا ہے لیکن درحقیقت ذاتی پسند اور ناپسند کا اظہار کرنا خالص دھوکا ہے، قطع نظر اس سے کہ سائنس دان کے "محرکات" اور مقاصد کتنے ہی قابل ستائش اور معاشرتی نقطۂ نظر سے پسندیدہ ہوں۔

لیکن کیا یہ کسی شخص کے لئے ممکن ہے کہ وہ دو الگ کردار (مثلاً سائنس دان اور شہری) انہیں خلط ملط کئے بغیر ادا کر سکے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا ہر روز ہو رہا ہے۔ یہ نہایت ہی پیش پا افتادہ قول ہے کہ وہ ایکٹرس جو شام کو جولیٹ کا پارٹ ادا کرتی ہے اور رات کو لیڈی میکبتھ کا ایک پارٹ کی ترجیح کو دوسرے پارٹ کی ادائیگی پر اثرانداز نہیں ہونے دیتی۔ ہو سکتا ہے کہ اُسے ایک ہی دن میں بیوی، ماں وغیرہ کا پارٹ بھی ادا کرنا پڑے۔ اسی طرح وہ کیمیا دان جو بعض گیسوں کے حربی استعمال کے خلاف پرزور مہم چلاتا ہے اپنے اس نقطۂ نظر کو ان گیسوں کے پیدا کرنے یا تحلیل کرنے میں ذرا بھی اثرانداز نہیں ہونے دیتا۔ سائنس بحیثیت سائنس غیر اخلاقی ہے۔ سائنسی سرگرمی میں کوئی ایسا عنصر نہیں ہے جو یہ حکم دے کہ سائنس کے نتائج فلاں فلاں مقاصد کے لئے استعمال کئے جائیں۔

الغرض یہ کہنا درست نہیں کہ "کسی ایسے نظام کو سمجھنا یا اس کی تشریح کرنا جس میں اقدار شامل ہوں ان اقدار کے کسی قدر ادراک کے بغیر ناممکن ہے"۔ میں یہ رپورٹ کر سکتا ہوں اور سمجھ سکتا ہوں کہ ایک خاص قبیلہ اپنے بوڑھے افراد کو مار ڈالتا ہے اور انہیں کھا جاتا ہے بغیر اس کے کہ میں اس رواج کی اچھائی یا بُرائی کے متعلق اپنے معیاروں کی روشنی میں ایک لفظ بھی کہوں یا اپنے معیاروں کو ان امور کی غیر جانبدارانہ رپورٹ میں مانع ہونے دوں۔ وہ قدری آرا جو کوئی سائنس دان اپنے مواد کے متعلق قائم کرتا ہے صرف یہ ہوتی ہیں کہ اس کے مقدمات کا پیشِ نظر قضیے سے کیا تعلق ہے، ہر پہلو کو کتنی اہمیت دینی چاہیئے اور واقعات کی عام تشریح کیسے کرنی چاہیئے۔ یہ ایسے مسائل ہیں جن سے کسی سائنس دان کو مفر نہیں اور یہ کسی طرح بھی عمرانی علوم میں یکتا یا لاینحل نہیں ہیں۔

تو کیا سائنس دانوں کا یہ فرض نہیں کہ وہ اُن مقاصد کی تعیین کریں جن کے حصول کے لیے سائنس کا استعمال لازمی ہے؟ بحیثیت سائنس دانوں کے یہ ان کا فرض ہے کہ وہ متبادل امکانی منہاجوں کے متصل اور بعید مصارف اور نتائج کا قابلِ اعتبار اندازہ کریں اور انہیں عوام کے علم میں لائیں۔ اس کے بعد سائنس دان بحیثیت شہریوں کے دوسروں کے ساتھ مل کر اپنی پسند کے مطابق ایک متبادل کی بجائے دوسرا اختیار کرنے کی تلقین کر سکتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ میرے اس موقف کے متعلق بہت غلط فہمی موجود

ہے۔ کئی متین سائنس دان اور ادیب محسوس کرتے ہیں کہ میں نے جو سائنس دان بحیثیت سائنس دان اور سائنس دان بحیثیت شہری میں امتیاز کیا ہے وہ کسی نہ کسی طرح غلط یا گمراہ کن ہے۔ مثلاً سی۔پی۔ سنو کہتا ہے کہ "چونکہ سائنس دان ایک خاص قسم کا علم رکھتا ہے اس لئے اس پر ایک راست اور ذاتی ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ یہ کہنا کافی نہیں کہ سائنس دانوں کی بحیثیت شہریوں کے کچھ ذمہ داری ہوتی ہے۔ ان کی ذمہ داری اس سے کہیں زیادہ ہوتی ہے (۱) اور مختلف قسم کی (۲) کیونکہ سائنس دانوں کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ وہ جو کچھ جانتے ہیں وہ بتائیں بھی۔"

میں اس سے یقیناً متفق ہوں کہ یہ سائنس دانوں کا بحیثیت سائنس دان اور بحیثیت شہری دونوں طرح سے اخلاقی فرض ہے۔ سائنس کے تقاضوں میں سے ایک یہ ہے کہ سائنس دان اپنے نتائج شائع کرے اور ان تک پہنچنے کا طریقہ بتائے۔ یہ خیال کہ یہ فرض غیر سائنس دانوں پر عائد نہیں ہوتا مجھے بودا معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ ان کے علم میں ہو کہ ایک مہلک بم تالار بلدیہ کے نیچے رکھا ہوا ہے یا پینے کے پانی میں زہر ملایا جا رہا ہے تو شہریوں کی حیثیت سے سائنس دان اور غیر سائنس دان دونوں کا اخلاقی فرض ہے کہ "وہ جو کچھ جانتے ہیں بتائیں بھی"۔ یہ کہنا مجھے لغو معلوم ہوتا ہے کہ سائنس دان کی حیثیت سے یہ سائنس دان کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ تالار بلدیہ کو بھک سے اڑ جانے سے بچائے بھی۔ یہ سوال کہ آیا تالار بلدیہ کو اڑایا جائے یا نہ اڑایا جائے سائنسی سوال نہیں ہے۔ نہ

ہی یہ ایسا سوال ہے جس کا کوئی بھی سائنس جواب دے سکتی ہے۔ بہر حال طبیعیات تو اس کا جواب ہرگز نہیں دے سکتی۔ اپنے علم کا اظہار کرنے کے نہایت خطرناک نتائج ہو سکتے ہیں جن کے سائنس دان اور غیر سائنس دان دونوں تابع ہیں۔ جیسے سنو نے اشارہ کیا ہے خوش قسمتی سے ایسے معاملات میں سائنس دان بھی اتنی ہی اخلاقی قوت کے مالک ہوتے ہیں جتنے کہ غیر سائنس دان۔ اس طرح ہم ان عظیم حادثات سے بچ جاتے ہیں جن کا ہمیں بصورت دیگر خطرہ ہو سکتا ہے۔

اس کی وضاحت ایک مثال سے ہو سکتی ہے۔ امریکا میں ایک قانون بنا جس کے تحت نیشنل سائنس فاؤنڈیشن (سائنس کا قومی کارپوریشن) قائم ہوا۔ اس کے متعلق سینیٹ کی ایک کمیٹی نے استفسارات کئے۔ کمیٹی کی رپورٹ کا ایک اقتباس یہ ہے:

سینیٹر ٹل برائیٹ: کل میں نے ایک ممتاز سائنس دان سے درخواست کی کہ وہ عمرانیات کی تعریف کرے۔ دراصل میں اس کے متعلق سوچتا رہا تھا۔ اس نے اپنی تعریف میں کہا: "اول یہ کہ میں اسے سائنس کہنا ہی نہیں چاہتا۔ جسے عام طور پر عمرانیات کہا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک فرد یا افراد کا گروہ دوسرے فرد یا افراد کے گروہ کو بتاتا ہے کہ انہیں کس طرح زندگی بسر کرنی چاہیئے۔"

سب جانتے ہیں کہ یہ رائے عام طور پر مانی جاتی ہے اور بدقسمتی سے یہ بڑی حد تک ذمہ دارانہ بھی ہے۔ لیکن میں دعوے سے کہتا ہوں

کہ یہ رائے لازمی طور پر درست نہیں۔ چنانچہ تمام عمرانیات دانوں کا ایک مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اس رائے کو ہمیشہ غلط ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے لئے انہیں پہلے اس پر متفق ہونا پڑے گا کہ سائنسی عمل کا بنیادی وظیفہ کیا ہے۔ وہ وظیفہ یہ ہے کہ ایسے مربوط اور معنی خیز "اگر۔۔۔ تو" والے قضیوں کو محنت سے وضع کر کے شائع کیا جائے جن کا خاص حالات میں خاص حد تک قریب بہ صحت ہونا ثابت ہو سکے۔ اس تعریف کے مطابق "اپنے علم کا اظہار کرنا" یعنی اپنی دریافتوں کو شائع کرنا یقیناً" وضع فرض ہے لیکن اتنے ہی واضح طور پر یہ بات حلقۂ سائنس سے خارج ہے کہ سائنس دان بحیثیت سائنس دان یہ بتلائے کہ سائنسی علم کس مصرف میں لانا چاہیئے۔ یہ ظاہر ہے کہ شہری کی حیثیت میں سائنس دان کسی بھی طریق عمل کی پورے جوش و خروش اور تمام ذرائع سے حمایت کر سکتا ہے۔ اگر ہم سائنسی علم اور باقی ہر قسم کے علم کے مابین اس امتیاز پر اصرار نہ کریں تو ہم سائنس میں انسانی ترجیحات، مختلف مذاق اور اقدار داخل کر دیں گے جو سائنس کے لیے مہلک ثابت ہوگا۔ یہی وہ الزام ہے جس کا عمرانی علوم کو مورد ٹھہرایا جاتا ہے۔

کئی مخلص اور سمجھ دار اشخاص مذکورہ بالا موقف سے بڑی حد تک متفق ہوتے ہوئے بھی اس کے بعض مضمرات پر تشویش کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے سوال کی صورت یہ ہوتی ہے: مثالی سائنس دان سائنس دان ہونے کے منصب میں غالباً صرف ایک ہی عقیدے سے وابستگی رکھتا ہے۔

یعنی یہ کہ سائنسی تحقیق کے موجودہ ترقی پذیر منہاج باقی تمام منہاجوں سے اس کی زیادہ اہلیت رکھتے ہیں کہ ان سے معاشرے میں انسانوں کی رہنمائی کے لئے مفید اور ذمہ دارانہ نتائج مترتب ہو سکیں۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ایسا سائنس دان بحیثیت سائنس دان یہ بھی بتائے کہ ایسی تحقیق کے لئے کون سی طرز حکومت زیادہ سے زیادہ سازگار یا کم سے کم خلل انداز یا مزاحم ہوگی؟

میرے نزدیک اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ اگر سائنس اور سائنسی منہاج کی میری تعریف درست ہے تو ضرور ہے کہ میں اس سوال کا جواب نفی میں دوں۔ میں مانتا ہوں کہ ایک سائنس دان بحیثیت سائنس دان اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ اگر سائنسی ترقی کی کم و بیش حامی حکومتوں کے معیار مقرر کر دئے جائیں تو سائنس دان کے لئے بحیثیت سائنس دان یہ کہنا ممکن ہو جاتا ہے کہ حکومت ﺍ حکومت ب سے بہتر ہے کیونکہ اب "اگر ... تو" کے قضیے میں "اگر" کے معیار شامل ہو گئے ہیں۔ سائنسی اخلاقیات کا تقاضا ہے کہ وہ اپنی دریافتوں کو مع معیاروں کے شائع کرے۔ مجھے کسی ایسے قانون یا سائنس کا علم نہیں جو کسی سائنس دان سے بحیثیت سائنس دان تقاضا کرے یا اُسے اس کی اجازت دے کہ وہ ایسی طرز حکومت کی سفارش کرے جو مقررہ معیاروں کے مطابق سائنسی ترقی کے لئے بہترین ہو۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بحیثیت شہری یہ اس کا حق ہے اور فرض بھی کہ وہ نہ صرف اپنی دریافت شائع ہی کرے (جو سائنسی اخلاقیات

کے نقطۂ نظر سے بہرصورت ضروری ہے) بلکہ موزوں طرز حکومت کی سفارش بھی کرے۔ فیصلہ کن نکتہ یہ ہے کہ سائنسی نتائج ان معیاروں پر منحصر ہوتے ہیں اور یہ معیار سائنسی منہاجوں کے ذریعے وضع نہیں کئے گئے لیکن جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے وہ فرض کر لئے گئے تھے۔ وہ تمام سائنسی نتائج کا "اگر" ہیں۔ اور یہ "اگر" تمام سائنسی نتائج میں مضمر اور شامل ہوتا ہے۔ مقررہ شرائط کے بغیر کوئی سائنسی کلیے کسی بھی سائنس میں قائم نہیں رہ سکتے۔

سائنس دانوں کی شہرت اور اثر جتنا زیادہ ہوگا اور عوام ان کی پسند اور ناپسند میں جتنے زیادہ شریک ہوں گے اتنا ہی عوام ان کے پیش کردہ مقاصد کو تسلیم کریں گے۔ اِن معنوں میں عمرانیات بھی طبیعیات کی طرح لوگوں کی احتیاجات معین کرنے میں اثرانداز ہو سکتی ہے۔ یعنی سائنسی علم کے نتیجے میں عوام ناممکن یا متناقض چیزوں کے خواہاں نہیں ہوں گے۔ مثلاً وہ نہیں چاہیں گے کہ بیرونی تجارت کو بھی فروغ دیا جائے اور ساتھ ہی زیادہ وسیع اور بھاری محصول عاید کر دیا جائے۔ یا جرائم میں کمی کی کوشش کی جائے اور ساتھ ہی جرم افزا انتظام تعزیرات اختیار کیا جائے۔ یا کسی قوم کی قوت پیداآوری کو تباہ کیا جائے اور ساتھ ہی اس سے توقع رکھی جائے کہ وہ امن پسند، خوش حال اور جمہوریت پرست ہو۔ یا معانی ناشناس "مدبروں" سے توقع رکھی جائے کہ وہ جادو کے زور سے ایک عالمی ادارہ لا کھڑا کریں بیشتر اس

سکے کہ اس کی ترکیبی اکائیوں کو ایک وحدت میں مجتمع کیا جائے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عمرانی علوم کی ترقی اور سائنسی علم کے نفوذ سے لوگوں کی احتیاجات، خواہشات اور ترجیحات پر اثر پڑے گا۔ لیکن پھر بھی امر واقع کے اظہار اور کسی خاص چلن کو زبردستی منوانے کے درمیان اہم فرق ہے۔ اگر کوئی ڈاکٹر کسی مریض سے کہے کہ "اگر تم اپریشن نہ کراؤ گے۔ جس کی تمہیں روپے، وقت اور درد کی صورت میں اتنی قیمت ادا کرنی ہوگی، تو تم غالباً ایک مہینے کے اندر مر جاؤ گے"۔ تو یہ ایک بات ہے۔ لیکن اگر وہ کہے کہ "سائنس جس کا میں مسلم نمائندہ ہوں یہ کہتی ہے کہ تمہیں اپریشن کرانا ہوگا" تو یہ دوسری بات ہے۔ جو سائنس دان یہ دعوے کرتا کہ سائنس اسے موخرالذکر بات کہنے کا اختیار دیتی ہے وہ فریب کار اور خطرناک ہے۔ اس قسم کا تحکمانہ انداز طبیعیات کی ترقی کے ساتھ رونما نہیں ہوا تھا اور اسے عمرانیات کی رسیدگی سے بھی پیدا نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ بات خاص کر آج کل خاطر نشین رکھنی چاہیئے، جب یہ سوال درپیش ہے کہ کیا سائنس دانوں کو جمہوری انشقاق کی ترقی کے نتیجے میں مبلغوں کی جماعت بن جانا چاہیئے جو عوامی پالیسیاں جبراً نافذ کرے؟

سائنس دانوں کے عمل امور سے تعلق کے بارے میں غلط فہمی اس قدر عام اور شر انگیز ہے کہ اس پر مزید توجہ کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ سائنسی علم کے استعمال کے لئے کوئی نہ کوئی قدری اندازے درکار ہیں۔ یہ

مسئلہ دوسری سائنسوں میں بھی موجود ہے۔ جب ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ ڈائناما یٹ کیسے تیار کیا جاتا ہے اور اس کے خواص کیا ہیں تو یہ سوال رہ جاتا ہے کہ کیا ہم اسے ہوائی جہازوں سے گرائیں اور گرجے اور شہر تباہ کردیں یا اسے پہاڑوں میں سڑکیں بنانے کے لئے استعمال کریں ؟ جب ہمیں بعض گیسوں اور دواؤں کے اثرات معلوم ہو جائیں تو یہ سوال رہ جاتا ہے کہ کیا ہم انہیں درد اور مرض کی تخفیف کے لئے استعمال کریں یا بے بس اور بے ضرر آبادیوں کو تباہ کرنے کے لئے؟ ترقی یافتہ کیمیا اور طبیعیات میں یقیناً کوئی ایسی شق نہیں جو ان سوالوں کا جواب دے سکے۔ اسی طرح عمرانی علوم کا بھی یہ فرض نہیں کہ وہ ایسے سوالوں کا جواب دیں (بجز مشروط طور پر) کہ ہمارے لئے کون سی طرز حکومت موزوں ہے، دوسری نسلوں سے ہمارا سلوک کیا ہونا چاہیئے، کیا ہمیں بعض مذہبی گروہوں سے رواداری برتنی چاہیئے یا انہیں ایذا دینی چاہیئے، کیا اور کس حد تک آزادیاں برقرار رکھنی چاہئیں ؟ اور اس قسم کے بیسیوں اور سوال جو ہمارے ذہنوں پر سوار رہتے ہیں، تو پھر عمرانیات دان کس مرض کی دوا ہیں اور وہ کیا کام سرانجام دے سکتے ہیں ؟

عام طور پر عمرانیات دانوں کا فرض یہ ہے کہ وہ عمرانی موسم کی بڑے یقین کے ساتھ پیشگوئی کر سکیں جس طرح موسمیات دان ابر اور آندھی کے متعلق کرتے ہیں۔ خاص طور پر عمرانیات دانوں کو یہ بتانے کے قابل ہونا چاہیئے کہ خاص حالات میں معاشرتی طور پر کیا ہونے کا امکان ہے۔

مثلاً ایک قابل معاشیات دان یا سیاسیات داں کو کسی خاص ملک کے لئے ایسا ٹیکس کا پروگرام مرتب کرنے کے قابل ہونا چاہیئے جس سے مطلوبہ آمدنی حاصل ہونے کا اغلب امکان ہو اور جس کا بار درجہ وار متعلقہ علاقے کے ہر گروہ پر مطلوبہ اندازے سے پڑے۔ عمرانیات دانوں کو یہ بتانے کے قابل بھی ہونا چاہیئے کہ اس پروگرام کے نفاذ کا آمدنی، سرمایہ کاری، صرف، پیداآوری اور آئندہ انتخابات پر کیا اثر پڑے گا۔ ایسا ٹیکس کا پروگرام مرتب کرنے اور اس کے اثرات وضاحت سے بیان کرنے کے بعد عمرانیات دانوں کا یہ فرض نہیں رہتا۔ جیسے یہ کسی بھی شہری کا فرض نہیں کہ وہ اس پروگرام کے اختیار یا رد کئے جانے کی سعی کرے۔ اسی طرح قابل عمرانیات دانوں، تدریسیات کے ماہروں یا نفسیات دانوں کو والدین کو یہ مشورہ دینے کے قابل ہونا چاہیئے کہ ضرورت کے مطابق کس طرح کسی لڑکے کو ایل کپون یا پسندیدہ شہری میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ کوئی سائنس بھی ہمیں یہ نہیں بتاتی کہ اس سے حاصل شدہ علم کا کیا استعمال کیا جائے۔ سائنس تو ہمیں صرف ایک موٹر اور ڈرائیور مہیا کر دیتی ہے۔ لیکن ہمیں وہ بحیثیت سائنس کے یہ نہیں بتاتی کہ ہم موٹر کو کہاں لے جائیں۔ یہ موٹر اور ڈرائیور ہمیں گڑھے میں پھینک سکتے ہیں، کھڈ میں دھکیل سکتے ہیں، پتھر کی دیوار سے ٹکرا سکتے ہیں یا انسان کی دیرینہ آرزوؤں کی منزل مقصود پر پہنچا سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنی

منزلِ مقصود پر متفق ہو جائیں اور ڈرائیور کو بتا دیں کہ ہمیں کہاں جانا ہے تو اُسے ہمیں وہاں پہنچانے کے قابل ہونا چاہیئے ۔ وہ ہمیں وہاں مختلف ممکن راستوں سے پہنچا سکتا ہے جن میں سے ہر ایک کے مصارف اور حالات سے ہمیں آگاہ کرنا سائنس دان کا فرض ہے۔ جب ان مختلف امکانات کی وضاحت ہو جائے تو سائنس دان کا یہ بھی وظیفہ ہے کہ وہ مسافروں کی خواہشات معلوم کرنے کے لئے ممکن حد تک زود کار اور قابلِ اعتبار آلہ تیار کرے ۔ لیکن اگر وہ خود مسافر نہ ہو تو ڈرائیور کے فرائض انجام دینے والے سائنس دان کا یہ فرض نہیں کہ وہ انہیں بتائے کہ انہیں کیا درکار ہونا چاہیئے ۔ طبیعیات یا عمرانیات میں کوئی ایسی شق نہیں جو اس سوال کا جواب دے سکے ۔ میرے خیال میں اس نکتے کے متعلق پراگندہ خیالی اس عام مغالطے کی بڑی وجہ ہے کہ کم از کم عمرانی علوم کو اس قسم کے قدری اندازے کرنے چاہئیں ۔

لیکن جیسا ہم دیکھ چکے ہیں اس سے یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ سائنس اپنے مذکورہ بالا وظیفے کی بدولت ہمارے لئے یہ فیصلہ کرنے میں بیحد مفید ثابت ہو سکتی ہے کہ ہماری احتیاجات کیا ہونی چاہئیں ۔ ہم اس موضوع کی طرف آخری باب میں رجوع کریں گے ۔ اس وقت ہمیں یہ ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ غالباً ہر جگہ لوگوں کی عام احتیاجات بڑی حد تک یکساں ہوتی ہیں ۔ مثلاً انھیں ایک خاص حد تک جسمانی اور معاشرتی تحفظ اور کچھ تفریح درکار ہوتی ہے ۔ طرح طرح کے عجیب و غریب

تصورات کے باعث حصول مقاصد کے ذرائع کے متعلق اختلاف پیدا ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ آویزش اور بدنظمی ہوتا ہے۔ میں بتا چکا ہوں کہ جب کوئی سائنس اچھی ترقی کر لیتی ہے تو وہ اس قابل ہو جاتی ہے کہ عمل کے متفاوت پروگراموں کے عواقب کی صحت کے ساتھ نشان دہی کر سکے۔ اگر ان عواقب کی قابل اعتبار پیش گوئی کی جائے تو یہ لازم ہے کہ اس سے ہماری احتیاجات کا انتخاب متاثر ہو۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ سائنس (عواقب کی پیش گوئی کرنے والے کے معنوں میں) اُن متعدد اثرات میں سے صرف ایک ہے جو کسی فرد کی احتیاجات اور اس کے متعاقب بیوہار کی تعیین کرتے ہیں۔ اب بھی سائنس اور سائنس دان انسان کے خادم ہیں آقا نہیں۔ لہٰذا ایسے سائنس دان جو اصرار کرتے ہیں کہ وہ سائنسی طور پر معاشرتی پالیسی کے نہ صرف ذرائع بلکہ مقاصد معین کر سکتے ہیں اُن کا اصلی کردار طشت از بام کر دینا چاہیئے کہ وہ دھوکا باز اور ہونے والے آمر ہیں۔ اس کے باوجود یہی وہ گروہ ہے جو دعوے کرتا ہے کہ وہ اُس موقف کے غیر جمہوری مضمرات پر متردد ہے جس کی میں حمایت کر رہا ہوں۔

بعض لوگوں کے نزدیک میرا یہ نظریہ "معاشرے کی اخلاقی اساس" کو غیر ضروری قرار دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ سوال معاشرے کی اخلاقی اساس کا نہیں بلکہ اخلاق کی معاشرتی اساس کا ہے۔ ہم صرف اخلاق کی سائنسی اساس کی حمایت کر رہے ہیں۔

غالباً اس پر سب متفق ہوں گے کہ اخلاق انسان کے لیئے ہیں، انسان اخلاق کے لیے نہیں۔ اخلاق چلن کے وہ قواعد ہیں جو انسان سمجھتا ہے کہ اس کے لئے صدیوں سے مفید چلے آرہے ہیں۔ پھر ہم سب اس پر متفق کیوں نہیں ہوتے کہ ہمیں اس موضوع کا ممکن حد تک مستند جائزہ درکار ہے!

۵۔ سائنس کی اخلاقی غیرجانبداری

چنانچہ اس کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ سائنس کے منہاج معاشرتی مسائل کو کیوں نہ حل کرسکیں۔ لیکن ہمیں عمرانیات سے طبیعیات کی نسبت زیادہ توقعات نہیں رکھنی چاہئیں۔ بحثیت سائنس عمرانیات اور طبیعیات کا ایک مشترک وظیفہ ہے۔ یعنی سائنسی سوالوں کے جواب مہیا کرنا۔ یہ جواب ہمیشہ غیرذاتی اور مشروط قسم کے ہوں گے۔ مثلاً "اگر تپش ۳۲ درجے ف تک گر جائے تو پانی جم جائے گا۔" "اگر ایک خاص قسم کا ٹیکس نافذ کیا جائے تو بعض قسم کی صنعتی سرگرمی ٹھنڈی پڑ جائے گی۔" ان دونوں میں سے کسی اظہار سے بھی یہ پتا نہیں چلتا کہ ان معلومات کو کس طرح استعمال کرنا چاہیئے یا انہیں استعمال کرنا بھی چاہیئے یا نہیں۔ سائنسی علم کی یہ خصوصیت کمزوری نہیں بلکہ اس کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق انسانوں کی احتیاجات بدلتی رہیں گی۔ سائنس کی اہمیت ٹھیک اسی میں ہے کہ وہ غیر ذاتی، غیرجانبدارانہ اور ہر مقصد کے لئے

مرذول ہوتی ہے۔

اس لئے ایسے سائنس دان اور دیگر اشخاص جو سائنس کو کسی خاص معاشرتی پروگرام، فرقے یا پارٹی سے تمیز نہیں کرتے سائنس کے سب سے زیادہ خطرناک دشمن ہیں۔ وہ اس کے آشکارا دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہیں کیونکہ "جمہوری" "اشتراکی" "مذہبی" یا "اخلاقی" سائنس کے حامی اپنے آپ کو سائنس کے حامی ظاہر کرتے ہیں اور اپنی تحریکیں اعلیٰ معاشرتی جذبات کے نام پر جاری رکھتے ہیں۔ یہ گروہ بدنیتی سے زیادہ ژولیدہ خیالی کا شکار ہوتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ تجویز کرتے ہیں کہ سائنس دانوں کو قسم کھانی چاہیئے کہ وہ کوئی ایسی سائنسی کارروائی نہیں کریں گے جو "تباہ کن" ہو یا "رواداری" "انصاف" وغیرہ کے منافی ہو۔ اس تجویز کی لغویت فوراً ظاہر ہو جاتی ہے اگر ہم کسی سائنسی عمل پر غور کریں۔ کوئی سائنس دان پیش بینی نہیں کر سکتا کہ اس کی کارگزاری کا کیا استعمال ہو گا۔ اور یہ تو بہرحال ایک پیش پا افتادہ بات ہے کہ ایک ہی دوا مارنے یا علاج کے لئے استعمال ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس قسم کی لغو تجویزیں اُس عارضی اور مجنونانہ خطرے کا نتیجہ ہوں جو ایٹم بم کی حیرت انگیز ترقی سے پیدا ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ ان ہنگامہ خیزوں کی نیتیں اعلیٰ معاشرتی جذبات پر مبنی ہوں۔ لیکن بدقسمتی سے یہی بات تعزیرِ ارتداد کے حامیوں کے متعلق بھی کہی جاتی تھی۔

اس سوال سے کہ سائنس یا اور کسی قسم کے علم کو کس طرح استعمال

کیا جائے انسان کا ہمیشہ جائز سروکار رہا ہے اور رہے گا۔ جیسا ہم دیکھ چکے ہیں اس سوال کا فیصلہ کرنے میں سائنس انسان کو بڑی مدد دے سکتی ہے۔ ہمارے موجودہ انتباہ کا مقصد یہ ہے کہ ہم اُن کوششوں کی روک تھام کریں جو سائنسی منہاجوں اور نتائج کو مسخ کرنا چاہتی ہیں۔ یہ کوششیں ان سائنس دانوں اور بااثر گروہوں کی طرف سے ہوتی ہیں جن کی پسند اور ناپسند ہنگامی ہے اور تنگ نظری پر مبنی۔

باب -۳

انسانی روابط پر سائنس کا اطلاق

نہاجوں پر اتفاق رائے

میں نے گزشتہ ابواب میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ موجودہ معاشرتی حالات
ں انسان کی نجات ایسی عمرانیات میں ہے جو طبیعیاتی سائنسوں کے بالکل
م پلہ ہو۔ میں نے ان اعتراضوں کا جائزہ لیا ہے جو طبیعیات دان اور
رانیات دان دونوں اس پر کرتے ہیں۔ میں اس غلط فہمی میں بھی مبتلا نہیں
ں کہ میں اپنے موقف کو اس مختصر سی تصنیف میں حتمی طور پر ثابت کر سکتا ہوں۔
یقت یہ ہے کہ میرے موقف کی صحت کا ثبوت صرف وقت اور سائنس کی
ندہ ترقی ہی دے سکتی ہے۔

بہر حال ہم پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ ہم اپنی مشکلات کا کوئی نہ کوئی حل
ش کریں۔ اس پر سب متفق ہیں اور بھی جو طریق کار کے متعلق شدید اختلاف

رکھتے ہیں)، کہ ہماری اہم ترین ضرورت ایک متحدہ، مربوط نظریہ ہے جس سے ابتدا کی جائے۔ کوئی معاشرہ یا فرد متباین یا متضاد بیوہار سے توافقات حاصل نہیں کر سکتا۔ لیکن تفصیلات اور مقاصد پہ ہم کتنا ہی اختلاف رکھتے ہوں ہمیں بعض عام ذرائع اور حصول مقاصد کے اصولوں پہ متفق ہو جانا چاہیئے۔

الغرض صورت حال کا وہ جائزہ جو کونت نے ایک سو سال پیشتر لیا تھا درست معلوم ہوتا ہے۔ دینیاتی، مابعدالطبیعیاتی اور انسانی سائنسی منہاجوں کا ذکر کرتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ "ان میں سے کسی ایک کا استعمال معاشرتی نظم کا ضامن ہو سکتا ہے لیکن گو یہ تینوں بیک وقت موجود ہیں ہم ایک دوسرے کو کسی اہم بات میں بھی نہیں سمجھ سکتے۔"

ایسے لوگ بلاشبہ موجود ہیں جو ہماری اس مشکل کو اس بات کے ثبوت میں پیش کریں گے کہ انسانی امور سمجھنے کے لئے سائنسی منہاج بیکار ہے۔ دراصل وہ یہ بات نظر انداز کر جاتے ہیں کہ سائنس کو معاشرتی مسائل میں ابھی آزمایا ہی نہیں گیا۔ لہٰذا وہ دینیات یا کلاسیکل ادب کی طرف رجعت کی سفارش کرتے ہیں۔ اگر میں دینیات یا کلاسیکل ادب کی طرف رجعت کا کوئی بھی امکان دیکھ سکتا تو میں اس پہ سنجیدگی سے غور کرتا کیونکہ کوئی بھی متحدہ منہاج دو یا زیادہ متضاد منہاجوں سے بہرحال بہتر ہے۔ لیکن میں ایسا کوئی امکان نہیں دیکھتا۔ جو ذمہ داریاں ہم نے سائنس (خاص کر اپنی صناعیاتی ثقافت) کی طرف سے اختیار کی ہیں وہ ایسی ہیں کہ اب ہم نہ واپس لوٹ سکتے ہیں نہ ساکن رہ سکتے ہیں۔

ہماری صناعیاتی ترقیوں اور آمد و رفت کے طریقوں کا نتیجہ ایک طرح کا بنیادی باہمی انحصار ہوا ہے جو ہماری زندگیوں پر حاوی ہے۔ جیسا ہم آگے چل کر دیکھیں گے اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے معاشرتی امور کو اس صناعیاتی صورتِ حال سے ہم آہنگ کریں نہ کہ اس کے برعکس۔ اس بنا پر، نہ کہ سائنس کے مفروضہ تفوق کی بنا پر، میرے خیال میں اس نتیجے سے مفر نہیں کہ "موجودہ زمانے میں اور آئندہ چند صدیوں تک ہر علم کی صحت کو طبیعیات اور عمرانیات کی روشنی میں پرکھا جائے گا۔"

اگر ہم یہ مان لیں تو کئی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ (۱) انسانی روابط میں ہم آہنگی کی ترقی کے بارے میں عمرانیات نے جو کچھ کہا ہے یا جو کچھ وہ کر سکتی ہے اس کی چند مثالیں کیا ہیں؟ (۲) اگر ایک ایسا معاشرتی نظام قائم کرنا مقصود ہو جس میں سائنس آخری عدالت مرافعہ ہو تو اس کے تقاضے اور مصارف کیا ہوں گے؟ اس تبدیلی کا جمہوری اداروں پر کیا اثر پڑے گا؟

اس باب میں ہم ان سوالوں پر غور کریں گے۔

۲۔ امکانات۔ چند مثالیں

انسانی روابط کے انصرام میں ماہرین عمرانیات کی کارکردگی کی چند مثالیں کیا ہیں؟

جب ہم ماہرین عمرانیات کی کارکردگی کا ذکر کرتے ہیں تو ہم ایک اتنے وسیع موضوع کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کا ایک مختصر سا خلاصہ دینا

بھی اس کتاب کی حدود میں ممکن نہیں تسلیم کردہ عمرانی علوم کم از کم پانچ ہیں
اور اگر ہم "بیویر ریٹ" کی اصطلاح استعمال کریں تو یہ تعداد بڑھ کر بارہ یا
اس سے زیادہ ہوجاتی ہے۔ عمرانی علوم ان معنوں میں تسلیم کردہ ہیں کہ ان کے
شعبے تقریباً تمام ممتاز یونیورسٹیوں اور کالجوں، نیز پیشہ ورانہ اور حکومتی
اداروں میں مستحکم طور پر قائم ہیں۔ ایک سو سے زیادہ رسالے ہر سال سینکڑوں
چھوٹی بڑی تحقیقی رپورٹیں شائع کرتے ہیں جن کا مقصد نئی معلومات بہم
پہنچانا یا پہلے نتیجوں کی تنقیح اور تہذیب یا معین حالات میں طرز عمل کی
پیش گوئی کرنا ہوتا ہے۔ ہم صرف چند مثالوں پر اکتفا کریں گے جو زیادہ تر
اس خیال سے چنی گئی ہیں کہ وہ انفرادی طور پر ایک سے زیادہ عمرانی علوم کے
لئے دلچسپی کا باعث ہیں۔ وہ قاری جو زیادہ جامع کوائف (بشمول منہاجی
تفصیلات) کے خواہش مند ہیں ان کے لئے متعدد تحریریں موجود ہیں۔

موجودہ مقصد کے پیش نظر ہم اس سوال میں (جس کی طرف ہم نے
پچھلے ابواب میں اشارہ کیا ہے) نہیں الجھیں گے کہ مختلف سائنسوں کی
کس حد تک تہذیب ہو چکی ہے۔ پچھلے ابواب میں جو میں نے بحث کی
ہے وہ زیادہ تر اس بنا پر تھی کہ عمرانی علوم کی آئندہ ترقی کی توقعات کیا ہیں
لیکن یہاں، اور کتاب کے آخر تک، میرا موقف یہ ہوگا کہ ان کی موجودہ
کوتاہیوں کے باوجود عمرانی علوم کو اہمیت دینی چاہیے۔ نیشنل سائنس
فاؤنڈیشن (سائنس کا قومی مؤسسہ) میں محکمہ عمرانیات کو ڈویژن کا درجہ
دینا اس کی بڑھتی ہوئی اہمیت کا ایک ثبوت ہے۔

محکمۂ مردم شماری جیسے اداروں کے کام سے واقفیت اتنی عام ہے کہ ان کی طرف خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ لیکن اس محکمے کی مہیا کردہ تفصیلات اور تشریحات کے بغیر عوامی امور کا نظم و نسق یقیناً ابتری میں تبدیل ہو جائے اور شاید خانہ جنگی چھڑ جائے۔ اتنا ہی یقینی یہ امر ہے کہ کوئی بین الاقوامی ادارہ مفید کام نہیں کر سکتا جب تک کوئی اس قسم کا مکمل ادارہ لوگوں اور ان کے خصائل اور سرگرمیوں کے متعلق بنیادی کوائف مہیا نہ کرے۔ بدنصیب جمعیت اقوام کا ایک قیمتی کارنامہ بین الاقوامی شماریاتی محکمے کا قیام تھا جو اس وقت تک زندہ رہا جب سے اقوام متحدہ کے اطلاعاتی اداروں نے اپنے ساتھ ملا لیا۔ پرنسٹن یونیورسٹی کا شعبۂ تحقیق آبادی دنیا کے مختلف حصوں میں بین الاقوامی آبادیوں کے میلانات کا تفصیلی جائزہ لیتا ہے اور اس نے پیش گوئیاں کی ہیں کہ آئندہ کن علاقوں میں آبادی کا دباؤ بڑھ جائے گا۔ یہ معلومات ہر قسم کے قومی اور بین اقوامی اداروں کے نظم و نسق کے لئے انتہائی اہمیت رکھتی ہیں۔ سکرپس فاؤنڈیشن، مل بنیک موریل فنڈ اور کئی دوسرے ادارے ایسا ہی یا اس سے ملتا جلتا کام کر رہے ہیں اور یہ کام ایسا ہے کہ طبیعیاتی علوم کے معیاروں پر پورا اترتا ہے۔

عمرانیات دانوں نے دنیا کے ایک سنگین ترین مسئلے کی نشاندہی کرنے میں بھی نمایاں حصہ لیا ہے۔ یہ ہے کثرتِ آبادی کا مسئلہ۔ علم طب کے استعمال سے جو شرح اموات میں حیرت انگیز تخفیف ہوئی ہے اس

کے نتیجے میں دنیا کی آبادی غیر معمولی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ مثال کے طور پر گو نوع انسانی کو ایک ارب کی آبادی تک پہنچنے کے لئے (تقریباً ۱۸۳۰ میں) ایک ہزار سال درکار ہوئے دوسرے ارب کا اضافہ کرنے کے لئے اسے صرف ایک سو سال درکار ہوئے۔ اور تیسرے ارب کا اضافہ کرنے کے لئے (غالباً ۱۹۶۵ سے پیشتر) اسے پینتیس ۳۵ سال سے بھی کم عرصہ درکار ہوگا۔ اقوام متحدہ کے ماہرین شماریات آبادی کا اندازہ ہے کہ چوتھے ارب کا اضافہ کرنے کے لئے صرف پندرہ سال درکار ہوں گے اور پانچویں کے لئے صرف دس سال، بشرطیکہ موجودہ شرح برقرار رہے۔ اگر افزائش آبادی کی موجودہ شرح قائم رہے تو یہ خیال کہ خوراک کی بہم رسانی کی ترقی لوگوں کی فاقہ زدگی میں عارضی تخفیف سے کچھ زیادہ کر سکتی ہے محض ایک دھوکا ہے۔ دراصل یہ خواہش مندی کو تلخ حقائق سے خلط ملط کرنے کا نتیجہ ہے۔

لیکن جس طرح صحت اور حفظان صحت پر سائنس کے اطلاق سے یہ صورت پیدا ہوئی ہے سائنس نے اس پر قابو پانے کے ذرائع بھی مہیا کئے ہیں۔ اور ان میں مزید ترقی اغلب اور قریبی ہے۔ ضبط آبادی کے معلوم منہاجوں کو وسیع پیمانے پر استعمال کرنے میں کئی ایسے مسائل شامل ہیں جو ابھی تک پوری طرح حل نہیں ہوئے لیکن جو عمرانیات دانوں کے زیر غور ہیں۔ بہر حال بعد از جنگ کے جاپان میں کامیاب ضبط آبادی کی مثال موجود ہے۔ ہمیں یہاں ان مسائل سے اتنا سروکار نہیں جتنا ان

سائنسی طریقوں سے حاصل کردہ اور تجزیہ کردہ کوائف سے جن کی مدد سے آئندہ آبادی کی پیش گوئی کی جاسکے اور خود کثرت آبادی کے مسئلے سے جسے بعض لوگ ایٹمی جنگ سے بھی زیادہ سنگین خیال کرتے ہیں۔ انفرادی ممالک کے اعداد و شمار اور اقوام متحدہ کے فراہم کردہ کوائف کئی ایسے سائنس دانوں کے لئے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں جو کئی طرح کے خاص منصوبوں میں مصروف ہیں۔ انسانی ماحولیات جو عوامیات، جغرافیے، عمرانیات، معاشیات سیاسیات (اور غالباً اوروں) کی حدود کاٹتی ہے، عملی اور نظری اہمیت کا بہت موثر کام کر چکی ہے۔

دوسرے لوگوں اور ثقافتوں کے متعلق قابل اعتبار اور معروضی معلومات فراہم کرنا ایک اور میدان ہے جس میں عمرانیات دانوں نے قابل قدر کام کیا ہے۔ ایسی معلومات سے ہماری اپنی تہذیب پر تیز روشنی پڑتی ہے اور ان سے انسانی برتاؤ کی قسموں کا صحیح اندازہ اور ان کے متعلق مفروضوں کی جانچ ہو جاتی ہے۔ HUMAN RELATIONS AREA FILES (انسانی روابط کی مسلیں) میں تقریباً دو سو ثقافتوں کے متعلق تمام قابل اعتبار معلومات باقاعدہ طور پر مرتب شدہ موجود ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی محقق دوسری ثقافتوں میں طلاق، جرم، تعلیم، قانون (اور تقریباً ایک ہزار دیگر) موضوعات سے دلچسپی رکھتا ہے تو وہ کم و بیش بیس لائبریریوں میں سے کسی ایک میں جاسکتا ہے جو یہ مسلیں منگواتی ہیں اور ان میں سے کسی یا سب موضوعات

کے تمام معلوم کوائف حاصل کر سکتا ہے۔ ہر موضوع کے متعلق معلومات الگ الگ دروازوں میں قرینے سے رکھی ہوتی ہیں اور یہ صرف چند گھنٹوں میں حاصل ہو سکتی ہیں حالانکہ انہیں سینکڑوں کتابوں میں جگہ جگہ ڈھونڈنے کے لیے کئی سال درکار ہوتے۔ اس قسم کی معلومات اور ان کی آسان دستیابی کی اہمیت دوسری عالمی جنگ کے دوران میں اور اس کے بعد ظاہر ہوئی جب ان کی مدد سے دوسرے ممالک اور ثقافتوں کے افراد سے ہمارے روابط میں سہولت پیدا ہوئی۔

ہم نے پچھلے باب میں مشاہدے اور پیمائش کے آلات اور منہاجوں کا ذکر کیا تھا جو طبیعیاتی اور عمرانی علوم ہر دو میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس میدان میں بھی ماہرین عمرانیات نے پچھلے تیس برس میں انقلاب انگیز ترقیاں کی ہیں۔ ہزاروں ایسے آلات ایجاد کئے گئے ہیں جن کے ذریعے پیشہ ورانہ صلاحیتوں، کالج میں کامیابیوں اور کئی اقسام کے معاشرتی بیوہار کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے اور ان کے متعلق صحیح پیش گوئی کی جا سکتی ہے قابلیت کی پیمائش کے آلات اور پیمانوں سے تحقیق کے لئے وسیع میدان کھل گئے ہیں۔

ان آلات میں معروف ترین غالباً رائے عامہ کا جائزہ ہے۔ اس طریق کار میں ہمیں یہ مثال ملتی ہے کہ عمرانیات کی ترقی کس طرح معاشرتی نظام کے مستقبل کے لئے اہم ہو سکتی ہے جیسے کہ طبیعیاتی ایجادیں صنعتی ترقی کے لئے ہوئی ہیں۔ ایسی تدبیریں جن سے عوامی ارادہ "حکومت اور

جماعت کی کارکردگی پر اثر انداز ہو سکتا ہے ہمیشہ سیاسی بحث کا اہم ترین موضوع رہی ہیں۔ رائے عامہ کے حلقۂ اثر میں توسیع ہو جانے سے اس مسئلے کے کئی محقق اس نتیجے پر پہنچ رہے ہیں کہ صرف عام جلسے عوامی ارادے کو کارگر نہیں بنا سکتے۔ اس صورت حال کے بپیش نظر رائے عامہ کا سائنسی جائزہ ایک ایسا آلہ ہے جس سے ہم سستے داموں اور صحت کے ساتھ عوام کے عقاید، رجحانات اور میلانات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ آج کل رائے عامہ کے جائزے کو زیادہ تر انتخابات کے نتائج کی پیش گوئی کرنے کی تدبیر خیال کیا جاتا ہے۔ ان سے ایسی پیش گوئی ضرور ہو سکتی ہے۔ لیکن یہاں کی پوری افادیت کا صرف ادنی جزو ہے۔ دوسری عالمی جنگ میں رائے عامہ کے جائزے بہت استعمال ہوتے تھے، مثلاً نئے مقبوضہ علاقوں کے نظم ونسق میں رہنمائی کے لئے، افواج کی واپسی کا وقت مقرر کرنے کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

رائے عامہ کا جائزہ ایسی تدبیر بھی ہو سکتا ہے جس سے آج کل کی سب سے بڑی ناقابل حل مشکل حل ہو جائے۔ یعنی آمرانہ اقتدار اور عوامی ارادے کا تضاد۔ ہو سکتا ہے کہ رائے عامہ کے صحیح جائزے کے ذریعے پیشہ ور سرکاری اہل کار ایسی کارگزاری کے قابل ہو جائیں جو مرکزی آمرانہ نظم ونسق سے منسوب کی جاتی ہے اور اس کے باوجود نظم ونسق عوامی ارادے کے زیادہ تابع رہے بہ نسبت اس کے جو روایتی جمہوری تنظیم میں ممکن ہے۔ الغرض یہ ناممکن نہیں کہ جیسے ہماری زندگی کے

طبیعی توانقات میں ترقی ہوتی جائے اور اس سے جمہوریت کی بقا کے لئے خطرہ پیدا ہو جائے تو اس کے ساتھ ساتھ معاشرتی تحقیق کا ایک ایسا اصلاح یافتہ آلہ بھی ایجاد ہو جائے جس سے انسانی معاشرے کے انصرام میں عوام کی آواز پہلے کی طرح بلکہ اس سے بھی مؤثر طریقے پر سنی جاسکے۔

ایسا وقت بھی آسکتا ہے جب رائے عامہ کا قابل اعتبار جائزہ ایک ایسی سائنس بن جائے جو موسمیات کے ہم پلہ ہو۔ معاشرتی موسم کے ہر قسم کے نقشے اور اس کی حرکات و میلانات کی پیش گوئیاں ہر ملک کے عوامی اداروں کے مہتمموں کے ہاتھ میں ہوں گی۔ بین اقوامی کشیدگی کا ایک ایسا بارہ پیما بنالیا گیا ہے جس سے ایسی کشیدگیوں کا جن کا نتیجہ جنگ ہوتی ہے پہلے سے کھوج لگایا جاسکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ایسی کشیدگیوں کا محض علم انہیں دور نہیں کرسکتا۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ کشیدگی کی قابل اعتبار تشخیص اور ان احساسات و جذبات کا علم جو اس کی تہ میں کارفرما ہیں اس کے حل کے لئے لازمی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ کچھ عرصے تک "مدبرین" اپنے وجدان کو سائنسی پیش گوئی پر ترجیح دیتے رہیں گے۔ اس میں شبہ نہیں کہ کچھ عرصے تک انسانی بیوہار کے ناگہانی ہونے کا فرسودہ قول سننے میں آتا رہے گا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ امریکا کے ۱۹۶۰ کے صدارتی انتخابات میں عمرانیات دانوں نے صرف ایک فیصدی سے کم غلطی سے چھ کروڑ اسی لاکھ رائے دہندگان کے بیوہار کی پیش گوئی کی تھی یا ئے عام

کا جائزہ لینے والے یہ عمل ۱۹۳۶ء سے کر رہے ہیں۔ اور انہوں نے اب تک زیادہ سے زیادہ چھ فیصدی تک کے برابر غلطی کی ہے۔ اور ایسے نتائج ووٹ دینے کے عمل تک ہی محدود نہیں۔ ہارورڈ کے آنجہانی پروفیسر سٹوفر نے پیش گوئی کی تھی۔ (ایک فیصدی سے کم کی غلطی سے) کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد کتنے سبکدوش شدہ سپاہی ایسے ہوں گے جوان کے لئے مہیا کردہ تعلیمی سہولتوں سے فائدہ اٹھائیں گے۔ دیگر کئی قسموں کے انسانی بیوہار کے متعلق بھی ایسی سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

ایسے لوگ جنہیں دنیا کی مشکلات کے فوری اور جاذب نظر حلوں کی توقع رہتی ہے انہیں اس قسم کی تحقیق ناگوار طور پر بے حیثیت معلوم ہوگی۔ ان کے نزدیک یہ "گھر پھونک تماشہ دیکھ" والی بات ہے "معنفین" بنیادی سائنسی کام کو "کنج عزلت" کہتے ہیں یا "جہازرانی پر تلقین جب جہاز ڈوب رہا ہو"۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ فن جہاز رانی کو اپنی موجودہ حیثیت اس طرح حاصل ہوئی ہے کہ بعض لوگوں نے اس موضوع کے اصولوں کی تحقیق اس وقت کی جب ان کے اپنے جہاز ڈوب رہے تھے۔ انہوں نے یہ نہ کیا کہ وہ ادھر ادھر بھاگتے پھرے اور لوگوں کو ادھ پکے اصولوں کی روشنی میں بتاتے رہے کہ ایسے جہازوں کو کیسے بچانا چاہیئے جو بہرحال بچ نہ سکتے تھے یا جو سرے سے بچانے کے قابل ہی نہ تھے۔ اے۔ جے۔ کارلسن نے حال ہی میں کہا تھا کہ "بعض

جراثیم کا بعض اقسام کی پھپھوندی کے قریب زندہ نہ رہ سکنا پہلے پہل ایک بیکار سی بات معلوم ہوتی تھی لیکن آج کل کوئی ہی ایسا شخص ہوگا جو اس دریافت کو بے کار کہے۔"

تو یہ ہیں چند مثالیں (نہ کہ خلاصہ) اس کام کی جو عمرانی علوم میں کیا جا رہا ہے اور جو کیا جانا چاہیئے۔ کیا یہ کام کافی مقدار میں ہو رہا ہے؟ یقیناً نہیں۔ ورنہ ہم قومی اور بین اقوامی امور میں یوں ٹھوکریں کھا کھا کر نہ گرتے اور نہ ہی ادھر ادھر بھٹکتے پھرتے۔ کیا عمرانی علوم دوسرے علوم کے دوش بدوش کھڑے ہو سکیں گے جن کی تیز رفتار ترقی آئے دن نئی معاشرتی اُلجھنیں پیدا کر رہی ہے؟ ایسا یقیناً ہو سکتا ہے بشرطیکہ ہم اتنی ہی توجہ اور روپیہ اس کام پر صرف کریں جتنا ہم نے طبیعیاتی تحقیق پر کیا ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ آج کل طبیعیات دانوں کو کتنے زیادہ ذرائع بہم پہنچائے جاتے ہیں تاکہ وہ ایک نیا آب دوز کشّاف یا ایک نیا بم ایجاد کریں یا زمانۂ امن میں پنسلین اور سلفا دواؤں پر تحقیق جاری رکھیں؟ ظاہر ہے کہ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ دراصل خاطرخواہ نتائج حاصل کرنے کا طریقہ ہی یہی ہے۔ لیکن کیا ایسا ہی سلوک عالمی تنظیم یا اس کے بے شمار ذیلی مسائل سے ہو رہا ہے جو سب کے سب امن اور خوش حالی کے لئے بڑے اہم ہیں؟

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انسانی روابط کی نوعیت پر بنیادی تحقیق کے سلسلے میں مقابلتہً کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ یہ درست ہے کہ جارحانہ حلقوں کے

نمائندے لاتعداد ادنیٰ منصوبوں، پیمائشوں، کانفرنسوں، تقریروں اور مباحثوں میں مصروف رہتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ سائنسی مسئلے محض بحث مباحثے سے کبھی حل نہیں ہوئے۔ لیکن وہ بنیادی معاشرتی تحقیق کے متعلق کچھ نہیں کرتے۔ اس طرف زیادہ توجہ کیوں نہیں دی جارہی؟ جیسا ہم نے پہلے باب میں کہا تھا اس کا ابھی تک احساس ہی نہیں ہوا کہ سائنسی علم کامیاب عالمی تنظیم کے لئے ضروری ہے۔ ہم اب تک یہی خیال کرتے ہیں کہ جہاں معاشرتی روابط کے انصرام کا سوال ہو تو عقل سلیم، خوش بیان لیڈر اور نیک ارادے ہی کافی ہیں۔

۳۔ سائنس کا اطلاق اور اس کی لاگت

اب ہم اپنے دوسرے سوال کو لیتے ہیں۔ ایسی عمرانیات پر کیا لاگت آئے گی جو جامعیت اور اعتبار میں زیادہ ترقی یافتہ سائنسوں کے برابر ہو؟ یہ لاگت بلاشبہ بہت بڑی ہوگی اور اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ لوگ کیا قیمت ادا کر سکتے ہیں۔ مادی اور نفسیاتی ہر دو قسم کی لاگت کی بڑی حدیں کیا ہیں؟

لاگت کے ذکر سے غالباً یہ سمجھا جائے گا کہ اب میں اصل موضوع سے ہٹ کر تحقیق کے مصارف کی بحث میں پڑ جاؤں گا۔ سائنس کی ترقی میں ایسے مصارف یقیناً شامل ہوتے ہیں لیکن یہاں میں ان سے سروکار نہیں رکھوں گا کیونکہ مجھے ایسے مصارف پر غور کرنا ہے جو روپے پیسے یا میزانیوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ جہاں تک نقد

مصارف کا تعلق ہے میں ہکسلی کے اس تخمینے پر اکتفا کرتا ہوں: " افراد اور اُن اداروں کے درمیان جنھوں نے اپنے آپ کو معلومات مہیا کرنے منصوبہ بندی کرنے اور کارکردگی کی تطبیق اور ضبط کے لئے وقف کیا ہُوا ہے ایک تناسب ہُوا کرتا ہے۔ اگر انسان بحیثیت مجموعی اتنی ہی پیش بینی، ضبط اور لچک حاصل کرنا چاہتا ہے جو حیاتیاتی سطح پر افراد کو حاصل ہے تو اسے اس تناسب کو دس گنا یا شاید پچاس گنا بڑھانا ہوگا" اس سے وہ ماہرین تدریسیات "چکرا جائیں گے جو اپنی موجودہ سرگرمیاں بحال رکھنا ہی مشکل محسوس کر رہے ہیں۔ لیکن ذرا یہ بھی تو خیال کیجئے کہ وہ کل خرچ جو ہم سائنسی تحقیق پر کر رہے ہیں اس خرچ کے مقابلے میں جو ہم جنگ پر کر رہے ہیں کتنا ہے؟ شاید آئندہ پشتوں میں کسی کو یہ خیال آجائے کہ اقوام عامہ کی نئی تعیین کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اگر ایسا ہو جائے تو عمرانی علوم میں مناسب تحقیق اور تربیت کے لئے مصارف مہیا ہو سکتے ہیں۔

لیکن کیا بعید از قیاس ہے کہ کسی آئندہ پشت میں ہم ان چیزوں کے متعلق جن پر روپیہ خرچ کرنا مفید ہو اپنے خیالوں میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا کریں گے؟ اس سے سائنس کے ایسے مصارف کا سوال پیدا ہو جاتا ہے جو غالباً مالی مصارف سے بڑھ کر ہیں اور جو ہم سے زیادہ گہرا تعلق رکھتے ہیں۔

اول یہ کہ عمرانی علوم کی ترقی سے ہم اس جذباتی ہیجان کی لذت

سے بڑی حد تک محروم ہو جائیں گے جو ہم میں معاشرتی حوادث سے پیدا ہوتا ہے۔" اعصابی جنگ" اس کی ایک مثال ہے۔ صورتِ حال کی سائنسی تشخیص کے مقابلے میں اس قسم کا ہیجان ہمارے انصاف اور نیکی کے گہرے جذبات کی زیادہ تشفی کرتا ہے۔ الغرض عمرانی علوم میں ترقی کی بڑی دقتوں میں ایک یہ ہوگی کہ ہمیں عمرانی حوادث کی ذاتیاتی اور اخلاقی تشریح سے دست بردار ہونا پڑے گا جس طرح ہمیں طبیعیاتی مظاہر کی ایسی تشریح ترک کرنی پڑی جب ہم نے سائنسی نقطۂ نظر اختیار کر لیا۔

سائنس میں ایسی ذاتیاتی اور اخلاقی تشریحوں سے دست برداری کے ساتھ ہی ہمیں ایک اور قسم کی دست برداری بھی کرنی پڑے گی۔ یعنی ہمیں متعدد الفاظ کو جن سے ہمارا گہرا جذباتی تعلق ہے ترک کرنا پڑے گا یا ان میں نئے مفہوم ڈالنے پڑیں گے۔ آزادی، جمہوریت، حریت، استقلال، آزادیٔ کلام، خود اختیاری اور اس قسم کے سینکڑوں تصورات کے متعلق عام لوگوں کے دلوں میں کبھی یہ سوال پیدا نہیں ہوا کہ ان کا مفہوم بدلتے ہوئے حالات سے کس طرح متاثر ہوا ہے۔ ایسا تجزیہ ان دل پسند رموز اور ان میں مضمر روحانیت پر حملہ معلوم ہوگا۔ جیسا ہر عمرانیات دان کو علم ہے یہ ایسے موضوعات ہیں جن کے بارے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

یا اس کی مخالف قسم کے الفاظ پر غور کیجئے۔ مثلاً" جارحیت" یا " تسخیرِ عالم"۔ ۱۹۴۰ میں ہم جرمنی کی جارحیت اور اس کے تسخیرِ عالم کے

مبینہ واضح ارادوں پر بڑے متردد ہوئے تھے۔ ۱۹۴۸ تک ہمیں یقین ہوگیا تھا کہ روس سب سے بڑا جارحیت پسند اور فاتح عالم ہے۔ اس کے کچھ بعد روس اور اس کے طرفداروں پر منکشف ہوا کہ جہاں تک جارحیت اور تسخیرِ عالم کا تعلق ہے امریکا سب سے زیادہ موردِ الزام ہے۔ ایک دفعہ اقوام متحدہ نے جارحیت کی تعریف کرنا چاہی تھی لیکن اُسے اس کوشش سے ہاتھ دھونے پڑے۔ بالآخر کثرت رائے سے یہ فیصلہ ہوا کہ جارحیت "ایک ایسا تصور ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی"۔

یہ عمرانی علوم کا فرض ہے کہ وہ ان تمام تعریفوں کی بغور جانچ کریں جو نہ صرف متعصب اور بے اصول اشخاص کی آخری جائے پناہ ہوتے ہیں بلکہ ایسی آڑ کا کام بھی دیتے ہیں جس کے پیچھے ہم ناگوار حقائق کو چھپا سکتے ہیں۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس مرض سے شفایاب ہونے کے لئے مریض کتنا شدید درد برداشت کرنے کو تیار ہوگا۔ وہ درد جو توہمات کا طلسم توڑنے، مستقل عاداتِ فکر کو ترک کرنے اور روایتی بیوہار کو خیرباد کہنے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پیشتر اس کے کہ مریض اس کڑوی دوا پر رضامند ہو اس کا مرض غالباً اب سے بہت زیادہ شدید ہو جائے گا۔

ہمیں عمرانی علوم کی ترقی کے لئے اور قیمتیں بھی ادا کرنی پڑیں گی۔ یعنی اُن انفرادی تصورات سے دست بردار ہونا پڑے گا جنہیں ہم نے قبل تاریخی دور سے ذہنوں میں بٹھا رکھا ہے اور اُن عزیز نظامہائے فکر سے کنارہ کشی کرنی پڑے گی جو اپنے دینیاتی پیشروؤں سے مافیہ میں

نہیں تو صورت میں مشابہ ہیں۔ یہ خیال کہ ایسے عمرانی مسائل کا آخری حل جو ہمیں متردد کر رہے ہیں ہماری ہی پشت میں مل جائے گا۔ ایک سراب ہے جسے چھوڑنا سائنس دانوں کے لئے بھی مشکل ہے۔ اب بھی کئی سائنس دان عمرانی علوم کو مارکسیت سے لے کر علم نجوم تک کئی مسلکوں، مذہبوں اور سیاسی عقیدوں سے گڈمڈ کرتے ہیں۔ سائنس دانوں کو یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ جمہوریت اپنی تمام خوبیوں کے باوجود تنظیم کی ممکن صورتوں میں سے صرف ایک ہے جن کے ماتحت انسان نے زندگی بسر کی ہے اور تہذیب حاصل کی ہے۔

یہ جمہوریت اور سائنس دانوں سے بے انصافی ہو گی اگر ہم یہ نامعقول دعوےٰ کریں کہ سائنس صرف کسی خاص حکومت کے تحت ہی پنپ سکتی ہے یا صرف ہمارے سیاسی نظام ہی کے ماتحت اقلیتوں کو حقوق حاصل ہیں۔ یہ ایک مقبول قول ہے کہ "سائنس صرف آزادی ہی میں پروان چڑھ سکتی ہے"۔ یہ ایک خوبصورت جملہ ہے لیکن افسوس کہ یہ دعوے کو بمنزلہ ثبوت مانتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسی آزادی جس کی سائنس محتاج ہے کن حالات میں مہیّا ہو گی؟ تاریخی حقیقت تو یہ ہے کہ سائنس کئی قسم کی حکومتوں کے تحت ترقی کرتی رہی ہے اور یہ بھی ہے کہ ہر قسم کی حکومت (بشمول جمہوریت) نے اسے کچلنے اور ناکام بنانے کی کوشش کی ہے۔ یورپ کی پہلی خالص جمہوری حکومت یعنی انقلاب فرانس نے اعلان کیا کہ "سائنس دان بیکار لوگ ہوتے

ہیں۔" چنانچہ اس نے کیمیا کے مخترع لوازیئے کا سر قلم کر دیا۔ آج سے چند ہی دہائیاں بیشتر امریکا کی کئی ریاستوں نے امریکی "مذہبوں" کی قیادت میں نظریہ ارتقا کی تعلیم کے خلاف قانون نافذ کئے۔ اس سے بھی کم عرصہ ہُوا کہ جاپانی نسل کے امریکی شہریوں پر جیل ہیں یہ انکشاف ہُوا کہ امریکی قانونِ حقوق کے اصلی معنی کیا ہیں، بالخصوص ایسی حکومت اور عدالت عالیہ کے ماتحت جو اقلیتوں کے حقوق کے متعلق رطب اللسان رہتی ہیں۔ الغرض قانون دانوں کی رائے کے مطابق امریکا میں اقلیتوں کی کم و بیش وہی حیثیت ہے جو ان کی نازی جرمنی میں تھی۔

بہرحال جمہوریتوں میں بھی "آزادی" اور سائنس دونوں پر حملے ہوتے رہتے ہیں۔ میں ایسے حملوں کی مذمت کروں گا گو وہ کہیں بھی ہوں۔ سائنس کو کسی بھی سیاسی پتنگ کی دم بنانے کے خلاف سب سائنس دانوں کو اور دوسروں کو جو خالص سائنس پر ایمان رکھتے ہیں پرزور احتجاج کرنا چاہیئے۔ سیاسی نظام بدلتے رہے ہیں اور بدلتے رہیں گے۔ سیاسی نظام نیست و نابود ہو گئے مگر سائنس زندہ ہے۔ سائنس جسے انسان ہر سیاسی نظام میں اور ہر مقصد کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔

یہ امر کہ میں ذاتی طور پر جمہوریت کو اس کی تمام لغزشوں کے باوجود پسند کرتا ہوں اور میرے نزدیک اس کے مروجہ بدل ناقابل قبول ہیں۔ اور میں اس طرزِ جمہوریت کی حمایت میں جس کا میں عادی ہوں جان تک

قربان کرنے کو تیار ہوں زیر بحث سائنسی مسئلے پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا۔ دراصل جمہوریت سے میری اس محبت کا سائنسی مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ میں ایک بدلتی ہوئی دنیا میں رہنے کے قابل نہیں ہوں۔ اس سادہ سے نتیجے کو قبول کرنا عمرانیات کے لئے اتنی بڑی قیمت ہے کہ غالباً چند اشخاص ہی اسے ادا کرنے پر رضامند ہوں گے۔

۴۔ عمرانیات دانوں کے فرائض

ہم ان مصارف کا جائزہ لے چکے ہیں جو ہمیں انسانی روابط کا سائنسی نقطۂ نظر اختیار کرنے کے لئے برداشت کرنے پڑیں گے۔ یہ مصارف سائنس دانوں اور دوسروں سب کو برداشت کرنے پڑیں گے۔ عمرانیات دانوں کو اپنے وہ خاص فرائض انجام دینے کے لئے جن کا میں نے ذکر کیا ہے آزادیٔ کار کی ضرورت ہے۔ ان کے لئے مستقبل میں کیا توقعات ہیں؟

عمرانیات دانوں کو ان مشکلات سے بچنے کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے جو سارے تاریخی دور میں دوسرے سائنس دانوں کے درپیش رہی ہیں۔ کیمیا دانوں اور طبیعیات دانوں کو وقتاً فوقتاً عقوبتیں جھیلنی پڑیں کیونکہ ان کی دریافتیں عام طرز خیال سے متصادم ہوئیں۔ لیکن وہ اپنے راستے سے نہیں ہٹے تاآنکہ انہیں تحقیق میں ایک خاص حد تک بے خوفی اور آزادی حاصل ہو گئی ہے جس میں عمرانیات دان شریک نہیں رہیں۔ بدلتے ہوئے سیاسی نظاموں کے باوجود طبیعیات دانوں کو کیوں نسبتی تامین

حاصل ہے اور عمرانیات دان اتنی ہی تامین کس طرح حاصل کر سکتے ہیں؟

رائے عامہ کے مطابق اس کا جواب اس مخصوص نفس موضوع میں مُضمر ہے جس سے عمرانیات کو سروکار رہا ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ درست نہیں۔ میرے خیال میں عمرانی علوم کی غیر مستحکم حالت کی اس سے بہت زیادہ بنیادی وجہ ان کی اپنی نسبتی نااہلی ہے۔

بدقسمتی سے عمرانیات دان ابھی تک لوگوں کی بڑی تعداد کو قائل نہیں کر سکے کہ وہ ایسے علم کی جستجو کر رہے ہیں جس کی صحت سائنس دان کی اپنی ترجیحات، امید وغیرہ کے باوجود ثابت کی جا سکتی ہے۔ تمام سائنسیں اس مرحلے سے گزر چکی ہیں۔ جب کوئی سیاسی انقلاب رونما ہوتا ہے تو اس پر طبیعیات دان عمرانیات دانوں کی نسبت کم متردد ہوتے ہیں کیونکہ اول الذکر کا کام ہر نظام میں یکساں اہمیت کا خیال کیا جاتا ہے۔ عمرانیات کو بھی یہی حیثیت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ انفرادی طبیعیات دان عقوبت کا شکار ہو سکتے ہیں لیکن ان کے بعد آنے والے ان کے کام کو انہی کے طریقے پر جاری رکھتے ہیں۔ اگر عمرانیات دانوں کے پاس بھی مسائل کے حل تلاش کرنے کے لئے ایسا ہی علم اور طریق کار ہو تو وہ بھی سیاسی انقلابات کی دسترس سے باہر ہو جائیں اور عمرانیات دانوں کی خدمات فاشستوں، اشتراکیوں اور جمہوریت پسندوں کے لئے ویسی ہی ناگزیر ہو جائیں جیسے طبیبوں اور طبیعیات دانوں کی۔ سیاسی نظاموں نے طبیعیات دانوں کی دریافتیں بھی بعض اوقات نظر انداز کی ہیں لیکن جب کبھی ایسا ہوا

آخر میں سیاسی نظام ہی ہارانہ کہ سائنس ۔

یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ ترقی یافتہ سائنسوں پر سیاسی مداخلت کا بہت کم اثر ہوتا ہے ۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ایسی مداخلتوں کا انفرادی تحقیقوں اور منصوبوں پر بسا اوقات نقصان دہ اثر پڑتا ہے لیکن اگر ہم پچھلے دو سو برس کی سائنسی ترقی کا عمومی جائزہ لیں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ نام نہاد "معاشرتی دباؤ" جس میں بڑے بڑے سیاسی انقلابات شامل ہیں اسے اپنی عام ڈگر سے بہت ہی کم ہٹا سکا ہے یہ سائنس کے عقوبت رسانوں نے اس پر بڑے حملے کئے ہیں گو یہ سطحی اور عارضی ہی تھے ۔ لیکن ہر مقصد کے حصول میں سائنس کی مسلم برتری نے بالآخر انہیں بھی اسی کی طرف رجوع کرنے پر مجبور کر دیا ۔ جرمنی اور روس کی حالیہ تاریخ اس کی مثالیں ہیں ۔

میں نے تاکیداً کہا ہے کہ طبیعیات دان ہر سیاسی نظام کے لئے ناگزیر ہیں ۔ عمرانیات دانوں کو بھی یہی حیثیت حاصل کرنے کی سعی کرنی چاہیئے بعضوں نے اسے ایک حد تک کر بھی لیا ہے ۔ جب تک معاشرتی شماریات کے ماہرین اپنی تحقیق سے سروکار رکھیں گے کوئی سیاسی پارٹی ان کے کام میں خلل انداز نہیں ہوگی ۔ ان کی مہارت اسی میں ہے کہ وہ معاشرتی بیوہار کے مشاہدہ کردہ کوائف سے نسبتہً صحیح، غیر جانبدارانہ اور قابل اثبات نتائج اخذ کرنے کے قابل ہوں ۔ معاشرتی اعتراضات کے باوجود اس طریق کار میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ۔ کوئی سیاسی نظام اس طریق کار کے

بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ایسی ہی مہارتوں اور ان کے استعمال کی بنا پر کوئی سائنس دان بجا طور پر علمی آزادی کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ اگر یہ مطالبہ ایسے اشخاص کے لئے کیا جائے جو اسی قضیے کو فرض کر لیتے ہیں جس کا ثبوت ہم پہنچانا ہے تو اس کا نتیجہ علمی آزادی کے اصول ہی کی نفی ہو گا۔ اسی وجہ سے ہمیں علمی آزادی کے لئے ایسا اندھا دھند جہاد نہیں کرنا چاہیئے کہ ہم اُن بنیادوں کو استوار کرنا ہی بھول جائیں جن پر بالآخر علمی آزادی کی عمارت اٹھائی جائے گی۔ یہ بنیاد کیا ہے؟ علمی آزادی سے متمتع ہونے والوں کی یہ قابلیت کہ وہ عمرانی حوادث کا صحیح اور غیر ذاتی تجزیہ کر سکیں۔

کسی خاص موقف کی وکالت کرتے ہوئے بھی یہ تحریص بڑی قوی ہوتی ہے کہ ہم اپنے آپ کو حقیقت کا غیر جانبدار تشخیص کنندہ ظاہر کر کے اپنی دل پسند "تحریک" کو تقویت پہنچائیں۔ اسی طرح با اثر حلقوں کے دباؤ سے بچنے کے لئے بھی یہ تحریص قوی ہوتی ہے کہ ہم علمی آزادی کی آڑ میں پناہ لیں۔ خصوصی وکالت کی صحیح ماہیت سمجھ لینی چاہیئے گو اس سے صنعتی تنظیموں کی کانگرس یا صنعت کاروں کی قومی انجمن کی خدمت ہی کیوں نہ مقصود ہو۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں کہ یونیورسٹیاں کسی خاص موقف کی وکالت کے لئے مجالس مباحثہ منعقد کریں یا سائنس دان ایسے مباحثوں میں حصہ لیں، بشرطیکہ اس کارروائی کو "سائنس" کا نام نہ دیا جائے۔ سائنس دان اس امتیاز کو بسا اوقات بھول جاتے ہیں اور اپنی پسند کے حق میں بڑے لغو سائنسی دلائل پیش کرتے ہیں۔

معاشرتی نظام کی وہ صورت جس سے عوام کو مطلوبہ دل جمعی حاصل ہو سکے بہت سے مختلف عناصر پر مبنی ہے جن میں روایات، وسائل، ضروریات، سائنسی ترقی اور تعلیم شامل ہیں۔ سائنس دانوں کو یہ بالکل واضح کر دینا چاہیئے کہ ان معاملات میں ان کی اپنی پسند محض ذاتی پسند ہے نہ کہ ایسا سائنسی نتیجہ جو ہر زمانے، ہر جگہ اور عوام کی ہر حالت میں درست ہو۔

چنانچہ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ معاشرتی علوم کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ بقدر امکان دوسری سائنسوں کے راستے پر گامزن ہوں۔ میں نے اس راستے کی مشکلوں کو کم کر کے دکھانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ البتہ میں نے یہ کہا ہے کہ یہ مشکلیں ناقابل تسخیر نہیں ہیں اور ہمارے لئے بہرحال اور کوئی چارۂ کار ہے ہی نہیں۔ ہم نے اپنی زندگیوں کے معتدبہ حصے میں اپنے آپ کو سائنس کے اندازہائے فکر اور اس کے مادی نتائج سے اتنا وابستہ کر لیا ہے کہ ہم بہرحال اسی سمت میں بڑھتے جائیں گے۔ الغرض میرا خیال ہے کہ عمرانی علوم کے جو میلانات حالیہ دہائیوں میں واضح طور پہ ظاہر ہوئے ہیں وہ روزافزوں رفتار سے جاری رہیں گے۔ عمرانیات دان باتیں کم کریں گے اور کام زیادہ۔ وہ بحث کی ایک زیادہ کفایت شعارانہ یعنی شماریاتی اور ریاضیاتی طرز پہ بیشتر سے بیشتر تکیہ کریں گے۔ بہت کچھ جو آج کل عمرانیات کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے دوسرے شعبوں کو سونپ دیا جائے گا، مثلاً صحافت، ڈراما یا عام ادب۔ اس طرح یہ سارا

مواد بطور پراپیگنڈا، معلومات، فنون اور لوگوں کے جذباتی نکاس کا جائزہ ذریعہ استعمال ہو سکے گا۔ انسان کی فنی، مذہبی، ادبی اور تفریحی سرگرمیاں بھی اُس کی آرزوؤں کی تسکین کا ذریعہ ہیں۔ میں نے انسانی امور کے سائنسی مطالعے کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں کہی جس کا یہ مطلب نکالا جا سکے کہ میں انسان کی سرگرمیوں کو بے کار سمجھتا ہوں یا ان پر کوئی پابندیاں لگانا چاہتا ہوں۔ اس کے برعکس میں نے یہ کہا ہے کہ معاشرتی علوم کو کوئی ایسی ذمہ داری اختیار نہیں کرنی چاہیئے جس سے وہ عہدہ برآ نہ ہو سکیں۔

بحیثیت سائنس دان عمرانیات دانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی کارکردگی کو تین فرائض کی انجام دہی تک محدود رکھیں: اول، اور اہم ترین، انہیں اپنے آپ کو ایسا قابلِ اعتبار علم فراہم کرنے کے لئے وقف کر دینا چاہیئے جو یہ بتا سکے کہ خاص حالات میں کون سی کارروائیاں ممکن ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے نتائج کیا ہوں گے۔ دوم، اپنی صناعیات کے جائز پہلو کے طور پر اور اس کے عملی استعمال کی خاطر بھی عمرانیات دانوں کو اس قابل ہونا چاہیئے کہ وہ خاص حالات کے تحت عوام کی احتیاجات کا صحیح اندازہ کر سکیں۔ آخر میں، جہاں تک ان کی سائنس کے عملی پہلوؤں کا تعلق ہے انہیں ان احتیاجات کی تسکین کے لئے انتظامی اور انجینیری طریقہائے کار تجویز کرنے چاہئیں قطعِ نظر اس سے کہ یہ احتیاجات کسی خاص زمانے میں کیا ہیں، وہ کس طرح وقتاً فوقتاً تبدیل ہوتے ہیں۔

اور سائنس دان کی اپنی پسند کیا ہے ۔

۵ ۔ کیا سائنس آمرانہ ہے ؟

ہم دو امور کا جائزہ لے چکے ہیں۔ اول، بعض کارگزاریاں جو عمرانی علوم کر چکے ہیں، بعض جو وہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور بعض جو انہیں کرنی چاہئیں۔ دوم، ہم نے ان مصارف پر غور کیا ہے، نقدی کی صورت میں بھی اور تبدیل شدہ انداز ہائے فکر کی صورت میں بھی، جو ہمیں معاشرے کی سائنسی تنظیم کے لئے برداشت کرنے پڑیں گے۔

انسانی روابط پر سائنسی نقطۂ نظر سے غور کرنے کے اور کون سے عواقب کی ہمیں توقع رکھنی چاہیئے ؟ سوال اُٹھایا گیا ہے کہ کیا مذکورہ بالا تجویز کا یہ مدعا تو نہیں کہ ہر شہری عمرانیات دان بن جائے ؟ اس کے برعکس اس تجویز کا مدعا یہ ہے کہ ہر شہری کو اُن ناممکن فرائض سے سبکدوش کیا جائے جو اس پر لادے جا رہے ہیں اور جنہیں وہ ناممکن ہونے کی وجہ سے سرانجام نہیں دیتا۔ طبیعیاتی سائنسوں کی ترقی سے یہ توقع پیدا نہیں ہوئی تھی کہ ہر شخص ہر سائنس کا ماہر بن جائے۔ ہم ہر شخص کو یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ کوئی ایسی شے ہے جسے سائنس کہتے ہیں اور اس کے لئے یہ بہتر ہے کہ وہ اس کے مسلم ماہروں سے مشورہ کرے نہ کہ خود نیم سائنس دان بن بیٹھے۔ یہ درست ہے کہ یہ کوئی بے خطا نظام نہیں ہے لیکن یہ اچھا خاصا کارگر ہے۔ میں عمرانیات کے متعلق بھی ایسے ہی نقطۂ نظر کی توقع رکھتا ہوں۔

تو کیا ہر شہری سے یہ توقع ہو گی کہ وہ عمرانیات دانوں کے نتائج پر اب سے زیادہ تکیہ کرے؟ ظاہر ہے کہ وہ جو چاہے کر سکتا ہے لیکن میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ وہ طبیعیات دانوں کے اقتدار کو آنکھیں بند کر کے تسلیم کرنے پر مائل ہے۔

عمرانیات دانوں کے نتائج کے متعلق ایسے رویے کو آمرانہ خیال کیا جاتا ہے، جو غالباً وہ ہے بھی۔ گزشتہ چند سالوں میں اقتدار کے متعلق بہت بے معنی باتیں کی اور لکھی گئی ہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ فی نفسہٖ اقتدار نہیں بلکہ نامعقول طریقے پر مقرر کردہ اقتدار ہے جس سے ہمیں خبردار رہنا چاہیئے۔ اگر ہم اس پر مصر ہونے کا تہیہ کر لیں کہ معاشرتی علوم میں بھی اقتدار کے وہی معیار ہوں گے جو طبیعیاتی علوم میں ہیں تو اس پر کوئی بھی متردد نہیں ہو گا کہ یہ اقتدار کس کو تفویض کیا جائے جس طرح طبیب کے اقتدار پر کوئی متردد نہیں ہوتا۔ ہر شخص جو تحکم کے ساتھ اظہار خیال کی جسارت کرے گا اس سے مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ اپنی تربیت اور کردار کے ویسے ہی شواہد پیش کرے جیسے طبیب اور دیگر پیشہ ور کرتے ہیں اور پیش بھی حکومت کو کرے۔ یہ شرط ہر ہونے والے صاحبِ اقتدار پر عاید ہو گی خواہ وہ خدا کی نیابت کا دعوےٰ کرے یا فطرت کی نیابت کا۔ اس کے بعد حکومت سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان معیاروں کی تفصیلات طے کرے اور ان کے انصرام کا کام ان پیشوں کے ارکان ہی کو سونپ دے۔ اس سے اس اصول کی اہمیت

میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی کہ آخری اقتدار حکومت کے مقبول عام نمائندوں کے ہاتھوں میں رہنا چاہیئے۔

یہ بات عام طور پر بغیر سوچے سمجھے درست مان لی جاتی ہے کہ اگر کافی تعداد میں انتخابات، اجتماعات اور جلسے منعقد کر لئے جائیں تو جمہوریت کے سارے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں۔ جمہوری طریقوں کے بعض انتہائی پرجوش حامیوں پر بھی بالآخر اب یہ انکشاف ہو رہا ہے کہ بعض روایتی جمہوری طریقوں کے ساتھ چمٹے رہنے سے ہم غالباً جمہوریت کے پوست کی تو حفاظت کر رہے ہیں لیکن اس کے گوشت کو چیلوں کو آگے پھینک رہے ہیں۔ مثلاً امریکن سول لبرٹیز یونین (امریکی انجمن اختیارات مدنی) جو حقوق مزدوراں کی زبردست حامی ہے، یوں رقم طراز ہے:

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دستور اور قواعد کی اصلاح فی نفسہٖ نہ انجمنوں کو جمہوری بنا سکے گی نہ غیر جمہوری اعمال کو روک سکے گی۔ کوئی قاعدے قانون اقتدار کے بھوکوں کو جلسوں میں اپنے پٹھوؤں کی بھرمار کرنے سے نہیں روک سکیں گے۔ وہ غنڈہ گردی کے طریقوں کا سدباب نہیں کر سکیں گے۔ وہ اقلیتوں کو محض ڈھٹائی کے زور پر اکثریتوں کو زک دینے سے باز نہیں رکھ سکیں گے۔ وہ اقلیتوں کو اکثریتوں میں پھوٹ ڈال کر انہیں نیچا دکھانے سے منع نہیں کر سکیں گے۔"

ظاہر ہے کہ یہ قول آجروں اور ہر دوسری قسم کی تنظیموں پر بھی صادق

آتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اب ہمیں نئی معاشرتی ایجادوں کی ضرورت ہے، ایک نئی صناعیات کی جس کی بدولت ہم مذکورہ بالا بدعنوانیوں کو ناممکن بنا کر عوامی اداروں سے آگاہی حاصل کر سکیں اور اسے کارگر بنا سکیں۔ اس کی وہ لوگ بلاشبہ مخالفت کریں گے جو جمہوری منہاجوں کے غلط استعمال سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ یہ بڑی قابلِ افسوس بات ہے کہ جمہوریت کے سب سے زیادہ چرب زبان حامی عام طور پر اس کے سب سے زیادہ خطرناک دشمن ہوتے ہیں۔

ان حالات میں ایک عام شہری حق بجانب ہو گا اگر وہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے کوئی اور ذرائع ڈھونڈے۔ وہ انجینیروں، ڈاکٹروں، وکیلوں اور معلموں کی بدعنوانیوں سے تو یوں بچ جاتا ہے کہ وہ ان سے حکومت کے مقرر کردہ معیار قابلیت پر پورا اُترنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ جب اس کی اس طرف سے تسلی ہو جائے تو وہ ارباب اختیار اور صناعوں کو پوری آزادی دے دیتا ہے اور انہیں عواقب کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ میری پیش گوئی ہے کہ شہریوں کے بیشتر فرائض کچھ عرصے کے بعد یہی صورت اختیار کر لیں گے۔ کچھ عرصے سے "محلہ گرد" غیر رسمی خدمت خلق کا کام کر رہے ہیں اور شہریوں کو بعض ذمہ داریوں سے نجات دلا رہے ہیں۔ اگر مطالبہ کافی پر زور ہو جائے تو یہی کچھ ہر جگہ قومی پیمانے پر بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر سائنس دان اپنی ذمہ داریاں قبول نہیں کریں گے تو عطائی ان کی جگہ لے لیں گے۔

اب تک ہر شہری پر بعض ذمہ داریاں تھوپی جاتی رہی ہیں۔ مذکورہ بالا میلان سے معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ ذمہ داریاں سائنس دان سنبھال لیں گے جو عوامی اقتدار کے تحت کام کریں گے خواہ وہ اقتدار مقامی ہو یا قومی یا بین اقوامی۔ ہم ان سوالات کے متعلق کہ حکومت کا موزوں یا پسندیدہ وظیفہ کیا ہونا چاہیئے، غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کر سکتے ہیں کیونکہ ان کا انحصار اس پر ہے کہ حکومت کی ترکیب کیسی ہے اور معاشرے نے کس حد تک سائنسی ترقی کی ہے۔ لیکن اس میں ہرگز شبہ نہیں ہو سکتا کہ موزوں ترکیب کی حکومت کا اقتدار اس سے بہرحال بہتر ہے جو اس کا بدل معلوم ہوتا ہے، یعنی نجی اور خود ساختہ قانون ساز مجالس، پولیس اور عدالتیں جیسی آج کل کئی ملکوں میں پائی جاتی ہیں اور جو اپنی نجی پسند دل کو عوام پر تھوپنا چاہتی ہیں۔

یہ صورت حال بالکل فطری ہے اور اس وجہ سے شاید خوش آیند بھی کہ یہ کسی قسم کی قیادت یا کسی قسم کا حل نہ ہونے سے بہتر ہے۔ جب لوگ مشکل میں ہوں تو وہ کسی ناجی کی راہ دیکھتے ہیں۔ اب ہر ملک میں ایسے لوگ موجود ہوتے ہیں جو اٹکل، جادو، جوتش یا وجدان پر عمل کرنا پسند کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا خاص کر نازک وقتوں میں برسر اقتدار آنا قرین قیاس ہوتا ہے اور یہ اغلب ہے کہ وہ اپنے گرد غیب دان، شاعر، ڈرامہ نگار اور دیگر ایسے افراد جمع کریں۔ ایسی حالت میں صرف ایک اصلاح کی ضرورت ہوتی ہے، یعنی ان غیب دانوں اور ساحروں کو

سائنس دانوں سے بدل دیا جائے۔ ہمیں پیش بینی اور غیب دانی کا فرق کبھی نہ بھولنا چاہیئے۔ پیش بینی کے معنی ہیں مصارف اور عواقب کی قابل اعتبار پیش گوئی کرنا اور غیب دانی سے مراد ہے آمرانہ طور پر بتانا کہ کون سا چارۂ کار اختیار کیا جائے۔

یہ امر باعث اطمینان ہے کہ ممتاز طبیعیات دان بھی اب اس سے اتفاق کرنے لگے ہیں۔ یہ اس امر کے پیش نظر اور بھی اہم ہو جاتا ہے کہ بعض سربرآوردہ طبیعیات دانوں کے فرسودہ عمرانیاتی تصورات اب تک عمرانیات کی طرف پسندیدہ رجحان کی ترقی میں حائل رہے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر فرینک، بی، جوئٹ، صدر نیشنل اکیڈیمی آف سائنسز (قومی جامعۃ العلوم) اور ڈاکٹر رابرٹ ڈبلیو کنگ کا مندرجہ ذیل مشترکہ بیان حوصلہ افزا ہے۔ فن ملک داری میں صنعتی تحقیقی لبارٹری جیسے شعبوں پر تبصرہ کرنے کے بعد یہ سائنس دان اس نتیجے پر پہنچے۔

"بیہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اب ہم اس دور میں آپہنچے ہیں جب حکومت کے تمام موجودہ مشاورتی شعبے، اور وہ بھی جو آئندہ قائم کئے جائیں گے، زیادہ تندہی سے کام کرنے لگیں گے۔ اس صورت حال میں دفتری حکومت کا دخل نہ ہوگا۔ عوام کی فرمانروائی پھر بھی برقرار رہے گی۔ یہ حقیقت سب پر عیاں ہو جائے گی کہ وہ دن گئے (غالباً ہمیشہ کے لئے) جب حکومتیں اپنی پالیسیاں بااثر حلقوں کے شور و غوغا کی بنا پر مرتب کرتی تھیں یا اکثریت کے جاہلانہ عقاید کی بنا پر گو اس

کی تعداد کروڑوں تک ہی کیوں نہ ہو ۔"

سائنس دانوں پر اب یہ حقیقت منکشف ہو رہی ہے کہ جب تک معاشرتی علوم ترقی نہ کریں باقی سائنسوں کی ترقی کا نتیجہ تباہی ہو سکتا ہے جب یہ پوری طرح ذہن نشین ہو جائے تو ہم معاشرتی علوم کے لئے بھی اسی تائید کی (انہی ذرائع سے اور انہی وجوہ کی بنا پر) توقع رکھ سکتے ہیں جو طبیعی علوم کو حاصل رہی ہے ۔ کچھ عرصے سے بلدیوں نے اپنے عملے میں عمرانیات دانوں کا اضافہ کرنا شروع کر دیا ہے کیونکہ ان کی تجارت اور زندگی سے جو توقعات ہیں وہ فیکٹری اور گروہ میں انسانی ضوابط کے توافق ہی سے پوری ہو سکتی ہیں ۔ عمرانیات دان طبیعیات دانوں کے مد مقابل نہیں ہیں بلکہ وہ ان کا تکملہ کرتے ہیں ۔ میکانکی صناعیات کی مزید ترقی کا کیا فائدہ اگر اس کا نتیجہ بموں سے ملک کی تباہی ہو ؟ جب یہ بات سمجھ میں آجائے گی تو ہر یونیورسٹی اور ہر بڑے کارخانے میں معاشرتی تحقیق کے ادارے قائم ہوں گے ۔ عمرانیات دانوں سے معجزوں کی توقع نہیں کی جائے گی ۔ ان سے صرف یہی توقع ہو گی کہ وہ انسان کے معاشرتی بیوہار کا اسی معروضیت ، مہارت اور خلوص سے مطالعہ کریں جو طبیعیاتی کائنات کے سمجھنے اور ضبط میں بروئے کار لائی گئی ہے ۔

باب-۴

سائنسی دور میں تعلیم

۱- "ادبی" راستہ

ہم نے گزشتہ ابواب میں ایک ایسے موضوع سے بحث کی ہے جس کی اہمیت سرد بازاریوں عصر سیاسی معاملوں اور جنگوں کے اُتار چڑھاؤ سے کہیں بڑھ کر ہے۔ یہ موضوع انسان کی فکر و عمل کے ایسے راستے کی دیرینہ جستجو ہے جو ہر حالت میں نسبتہ صحیح ہو قطع نظر اس سے کہ انسان کے مقاصد کیا ہیں اور وہ انہیں کیسی سیاسی تنظیموں کے ذریعے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ حکومت کی اُن طرزوں پر غور کیجئے جو گزشتہ چار سو سال میں برسر اقتدار رہی ہیں۔ یہ انتہائی مطلق العنان بادشاہت اور آمریت سے لے کر انقلاب فرانس کی انتہائی جمہوریت تک ہر طرز کی تھیں۔ لیکن ان سب انقلابوں، تحریکوں اور نظامہائے فکر میں ایک قدر مشترک موجود رہی ہے اور وہ

ہے سائنس کی مسلسل ترقی۔ انسان کی عام حالت میں جو اصلاح ہوئی ہے وہ اس کی بہت زیادہ مرہون منت ہے۔ بہ نسبت معاشرتی اور سیاسی تحریکوں کی جن کی بہت زیادہ تشہیر ہوتی ہے۔

تاہم آج عوام یہ گلہ کر رہے ہیں کہ گو سائنس ہمیں بلاشبہ ہمارے بعض مقاصد کے قریب لے آئی ہے اس نے ہمیں انسانی روابط میں وہ نظم و ضبط عطا نہیں کیا جس کی ہمیں سب سے اشد ضرورت ہے۔ گزشتہ ابواب کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ یہ حاجت جبھی پوری ہو سکتی ہے کہ ہم انسانی روابط کی سائنس کو ترقی دیں اور اس کا استعمال کریں۔ اب یہاں سے ہماری توجہ تعلیم اور تحقیق کے موضوع کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ یعنی اگر سائنسی منہاج اور خاص کر اس کا انسانی روابط پر اطلاق اتنا ہی اہم ہے جتنا ہم نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے تو ہماری تعلیمی کوششوں کی کامیابی اس سے جانچی جائے گی کہ اس منہاج سے اور اس سے تاحال حاصل شدہ قابلِ اعتبار کلیوں سے عام واقفیت کتنی ہے۔ معاشرتی علوم کی تعلیم کو اگر اس معیار پر پرکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ گویا ابھی شروع بھی نہیں ہوئی۔ یہ درست ہے کہ بہت زیادہ وقت اور نصاب کا بہت بڑا حصہ انسانی روابط کے موضوع کے لئے وقف کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ تقریباً تمام معلم خواہ وہ کوئی مضمون پڑھاتے ہوں وقتاً فوقتاً راستہ بدل کر عمرانیات سے بحث کرنے لگتے ہیں، غالباً اپنی ذاتی ترجیحات کا اظہار کرنے کی خاطر۔ اس موضوع کی اہمیت

دانش گاہوں کے باہر اس سے بھی زیادہ ہے۔ معاشرتی موضوعات پر اتنے زیادہ اور اتنے دھواں دھار الفاظ کبھی بولے یا لکھے نہیں گئے۔ بے شمار مجالس مباحثہ، اجتماعات، خطبے، گول میز کانفرنسیں اور ریڈیو کے مبصرین معاشرتی موضوعوں پر مسلسل لفاظی سے فضا کو بلوتے رہتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بحث بھی سائنس سے تعلق نہیں رکھتی۔ تقریباً سب بحثیں قانونی اخلاقی رنگ کی ہوتی ہیں اور انسانی بیوہار کے غیر سائنسی مفروضوں پر مبنی۔

واضح رہے کہ اگر میں اس قانونی اخلاقی نقطۂ نظر کا کم و بیش تحقیراً ذکر کرتا ہوں تو میں قانون یا اخلاق کی مذمت نہیں کرتا۔ قوانین اور اخلاق سائنسی دنیا میں بھی اتنے ہی ضروری ہیں جتنے کسی اور دنیا میں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں، ان کی نوعیت یا ان کے انسانی معاشرے میں آغاز کے متعلق اپنے ذہنوں میں کوئی توہماتی خیالات نہیں رکھنے چاہئیں نہ ہی ہمیں مثالی قوانین اور اخلاق کے متعلق لفاظیوں کو لوگوں کا فی الواقع بیوہار سمجھنا چاہیئے اور نہ ہی ہمیں ان حالات کو نظر انداز کرنا چاہیئے جن میں قانون اور اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔

میں نے گذشتہ ابواب میں بتایا ہے کہ افسانے اور حقیقت میں امتیاز کرنے میں ہماری یہ ناکامی ہمیں کس طرح گوناگوں ناقابل حل مشکلوں میں الجھا دیتی ہے۔ اس موضوع سے موجودہ دلچسپی کے پیش نظر میں یہاں بین اقوامی روابط کی حدود سے ایک اور مثال دینے کی جسارت

کرتا ہوں۔ ژیل (YALE) کے آنجہانی پروفیسر نکولس جے سپائیک
نے اپنی کتاب
MERICAS STRATEGY IN WORLD POLITICS (سیاسیات عالم میں امریکا کی حکمت عملی)
میں اس مضمون کا یہ خلاصہ دیا ہے:

"سترہویں صدی کے پیورٹین عقیدے کا ورثہ انسانی روابط کے متعلق ہمارے نقطۂ نظر کی ایک خاص کیفیت کا ذمہ دار ہے۔ چونکہ اس کا سروکار اخلاقی اقدار سے رہا ہے اس نے قوم کے ذہنوں کو گہرا اخلاقی رنگ دے دیا ہے۔ چنانچہ لوگ اسے اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ وہ دوسروں کی خارجہ پالیسی کا اخلاقی جائزہ لیں اور ہمارے صدر سے مطالبہ کریں کہ وہ وائٹ ہاؤس کو ایک ایسا منبر بنا دے جہاں سے انسان کو اس کی خطاؤں پر زجر و توبیخ کی جائے۔ اٹھارہویں صدی کی عقلیت کے ورثے نے ہمارے نقطہ نظر کو ایک اور خاص کیفیت دی ہے، یعنی قانون کی معقولیت پر ایمان۔ چنانچہ ہم بین اقوامی امور کے متعلق اخلاقی اور قانونی نقطۂ نظر کو کم و بیش جبلی طور پر ترجیح دینے لگے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ امریکیوں کی آنکھوں سے "سیاسیات اقتدار" کے حقائق او جھل ہو گئے ہیں۔"

اخلاقی وعظ کرنے سے کوئی قوم اتنی لطف اندوز نہیں ہوتی جتنے ہم۔ یہ انداز فکر سادہ لوحی کے مترادف ہے۔ لوگوں اور قوموں کو بعض طرح سے عمل نہیں کرنا چاہیئے، لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ اگر انہیں کافی پند و نصیحت

کی جائے تو وہ ایسا نہیں کریں گے۔ گو تمام تاریخ اس دلیل کے بودا ہونے پر شاہد ہے ہم اس سے پھر بھی چمٹے ہوئے ہیں۔ اور ہمارے اعمال بھی اتنے ہی سادہ لوح ہیں۔ ہم تمام قوموں سے معاہدے کرتے ہیں کہ ہم ترکِ جنگ کو اپنی قومی پالیسی کا جزو بنائیں گے اور پھر اطمینان سے بیٹھ جاتے ہیں جیسے اب جنگ کا امکان ہی نہیں رہا۔ یہ صغریٰ کبریٰ اور استدلال ویسے ہی ہیں جیسے جادو کے زور سے بارش برسانے کے۔ یعنی جب ہم چاہتے ہیں کہ بارش ہو تو بارش ہونی چاہیئے۔ چنانچہ بارش ہوگی۔ ہم نے بارش کے بارے میں اس قسم کے استدلال کی غلطی محسوس کر لی ہے اور ہماری درس گاہیں طبیعی حوادث کو متاثر کرنے کے جادو کے طریقے نہیں پڑھاتیں۔

لیکن درس گاہیں انسانی روابط کے بارے میں ابھی تک ان طریقوں کی تدریس کرتی ہیں کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ دوسری مخلوقات کے برعکس انسان جو کچھ کرتا ہے ارادے سے کرتا ہے یا کم از کم ایسی نیک یا بد طاقتوں کے اثر سے جو اس دنیا سے باہر ہیں۔ ہم یہاں جبر و اختیار کی بحث میں پڑنا ضروری نہیں سمجھتے۔ سائنس دان صرف آشنا کرنا چاہتا ہے کہ وہ ایسے کلیے مرتب کرے جو ان حالات کی وضاحت کر سکیں جن کے تحت انسان ارادہ کرتا ہے۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ اخلاقی طور پر ضرور نہ تھا کہ جرمنی دوسروں پر حملہ کرتا یا وہ خوراک کو توپوں پر ترجیح دے سکتا تھا، یا جرمنی کا معیار زندگی اپنے بعض ہمسایوں سے بلند تھا یا ہو سکتا تھا،

وغیرہ وغیرہ۔ سائنس داں کے نزدیک یہ سب کچھ غیر متعلق ہے۔ اس کی بجائے اس کی دلچسپی اس سے ہے کہ وہ ان حالات کا مشاہدہ کرے جن کے تحت قومیں جنگ میں اُلجھتی ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ ہماری اور ہر دوسری امن پسند اور آزادی پسند قوم کی توسیع کا یہ مطلب نہ تھا کہ پس ماندہ قوموں نے ترقی یافتہ قوموں کی لوٹ کھسوٹ کی بلکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ یہ مشاہدہ کردہ کیفیت اور ایسے اور کوائف سائنس داں کے لئے قابل لحاظ امور ہوتے ہیں جن سے اسے سروکار ہوتا ہے۔

الغرض ہم اپنی تعلیم میں ابھی تک ایک حد فاصل کھینچتے ہیں جو انسان اور اس کے معاملات کو باقی فطرت سے جدا کرتی ہے۔ اس حد کی ایک طرف کے مظاہر کو ہم مادی، طبیعی، فطری، حسی، وغیرہ کہتے ہیں اور دوسری طرف کے مظاہر کو غیر مادی، معاشرتی، ذہنی، اختیاری، ارادی، روحانی وغیرہ۔ یہ تفریق جس پر میں نے پہلے باب میں توجہ دلائی تھی، موجودہ ثقافت اور اجتماعی زندگی کا بنیادی مسئلہ ہے۔ اور یہ ایسا مسئلہ ہے جو متحدہ عمل اور منہاج کے بغیر حل نہیں ہوسکتا۔ یہ منہاج صرف سائنس ہی کا ہوسکتا ہے مگر افسوس ہے کہ اس تشخیص نے ہمارے نظام تعلیم کو ابھی زیادہ متاثر نہیں کیا۔

میں نے پچھلے باب میں اشارہ کیا تھا کہ انسانی روابط میں سائنس کی اہمیت کو تسلیم نہ کرنے کی بڑی وجہ وہ غلط فہمی ہے جو سائنس اور زندگی کے دوسرے شعبوں کے تعلق کے بارے میں پائی جاتی ہے۔ جب

عمرانیات کا شعور زیادہ واضح ہو جائے گا تو بہت ہی کم لوگ ایسے ہوں گے جو انسان کو اُس دور میں واپس دھکیلنا چاہیں گے جب وہ اپنے اور کائنات کے متعلق حیواناتی اور فوق الفطری تصورات رکھتا تھا۔ اب بھی حزب مخالف کے بعض عناصر نے روایتی حیواناتی بلکہ دینیاتی نظریہ ترک کر دیا ہے اور ایک طرح کا غیر جانبدارانہ موقف اختیار کر لیا ہے جو "کلاسیکل ادب" سے اخذ کردہ علم پر مبنی ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ صرف انسانی روابط ہی میں "کلاسیکل ادب" کا واسطہ دیا جاتا ہے تعجب ہے کہ یہ مشورہ کوئی نہیں دیتا کہ "کلاسیکل ادب" کو انجینیئری، طب یا زراعت میں بھی ہماری رہنمائی کرنی چاہیئے۔ "کلاسیکل ادب" کا بڑے سے بڑا حامی بھی اس سے متفق ہے کہ ان میدانوں میں تحقیقی لیبارٹریوں کے قابلِ اعتبار نتائج ہی سے استفادہ کرنا چاہیئے۔

وقت آنے پر ہم انسانی روابط اور کلاسیکل ادب کے تعلق کا بھی یہی نظریہ اختیار کر لیں گے۔

۲۔ تعلیم کا مواد

تو پھر موجودہ زمانے میں تعلیم کا مواد کیا ہونا چاہیئے؟ غالباً اکثر لوگ اس پر اتفاق کریں گے کہ عام تعلیم کا مقصد زندگی کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی قابلیت بڑھانا ہے جس سے خود طالب علم اور جماعت مطمئن ہو سکے۔ غیر ضروری بحث سے بچنے کی خاطر میں یہاں صرف ادنی سکولوں، ہائی سکولوں اور شاید کالج کے پہلے دو سالوں کی تعلیم کا ذکر کروں گا اور اعلیٰ اختصاصی تعلیم کو، جو چند

چیدہ لوگوں کے لئے ہوتی ہے، نظرانداز کروں گا۔

یہ سوال ابھی تک جواب طلب ہے کہ تعلیم کا کتنا حصہ درس گاہوں کی ذمہ داری ہونا چاہیئے اور کتنا دوسرے اداروں، مثلاً گھر، صنعت اور تفریحی جماعتوں کی۔ ہم غالباً اس پر متفق ہو سکتے ہیں کہ پیشہ ورانہ موضوعات کی تعلیم درسی فنون کے کالجوں کا بنیادی وظیفہ نہیں ہے گو ایسے موضوعات فرد کے لئے معاشرے سے توافق پیدا کرنے میں بے حد ضروری ہیں اور یہ کسی نہ کسی طرح کہیں نہ کہیں پڑھانے ضرور چاہئیں۔ اس کا فیصلہ کہ سکولوں میں کیا پڑھانا چاہیئے اور دیگر اداروں میں کیا اس پر منحصر ہے کہ زیادہ سے زیادہ تسلی بخش نتائج کس طرح حاصل ہوں گے۔

عمومی تعلیم کے مواد کے متعلق فیصلہ کرنے کے لئے ہمیں ایک اصول کارمل سکتا ہے اور وہ تقریباً مکمل اتفاق ہے جو ادنیٰ سکولوں کے نصابوں کے لئے مضامین مقرر کرنے کے سوال پر پایا جاتا ہے۔ تفصیلات میں یہ نصاب بہت مختلف ہوتے ہیں لیکن چند مضامین ان سب میں مشترک ہوتے ہیں۔ مثلاً پڑھنا، لکھنا، حساب اور طبیعیات اور عمرانیات کی مبادیات۔ میں اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ ہم اس سوال کی اہمیت کے پہلے ہی سے قائل ہیں۔ لہٰذا اگر ہم لفظی مراسلت کے فنون (بشمول ریاضیات) اور سائنس (طبیعیاتی اور عمرانی ہر دو) کی تحصیل نصاب میں شامل کریں تو ہم حق بجانب ہوں گے۔ نیز میرا خیال ہے کہ اس پر بھی عام اتفاق ہوگا کہ تعلیم میں ایسے مضمونوں اور پیوہاروں کا کچھ علم شامل ہونا چاہیئے

جن سے لوگ تفریح، سکون، اختراع اور مسرت کی توقع رکھتے ہیں۔ ایسے مضامین فنون ہیں۔ الغرض ہماری ثقافت میں عمومی تعلیمی نصاب کے دو شعبے ہونے چاہئیں: ایک سائنس کا، جس میں تجربی مراسلت شامل ہو، اور دوسرا فنون کا۔

تاریخ، فلسفے اور ادب ہی سے غالباً وہ پورا مواد بنتا ہے جسے ہم انسانیات کہتے ہیں۔ اگر اس مواد کی سائنس اور فن کے ماتحت نئی درجہ بندی کی جائے تو بعض اختلافات کی بڑی حد تک وضاحت ہو جائے اور وہ طے ہو جائیں۔ مثلاً روایتی فلسفہ، تاریخ تصورات اور مابعدالطبیعیات پر مشتمل ہوتا ہے۔ منطق کا تعلق قواعد زبان، معانیات وغیرہ سے ہے جن میں سے بعض سائنس کے لازمی آلات تسلیم کئے جاتے ہیں اور یوں خود سائنس نہیں تو سائنس کا ایک حصہ ہیں، بعینہٖ جیسے ریاضیات کو متفقہ طور پر سائنس کا آلہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ ایک نئی سائنس رموزیات جس کا موضوع رموزی بیوہار ہے، ظہور میں آ رہی ہے اور میرے خیال میں یہ معاشرتی علوم کے لئے اتنی ہی اہم ثابت ہوگی جتنی ریاضیات طبیعی علوم کے ارتقا میں ہوئی ہے۔ یہ تمام معاون مضامین عمومی تعلیم کے نصاب میں درجہ بندی کی کوئی مشکلات پیش نہیں کرتے کیونکہ انہیں بھی پڑھائی کی طرح، سائنس یا فن کے آلات کی حیثیت سے سیکھنا چاہیئے۔

تاریخ کی حیثیت غیر معمولی ہے کیونکہ اس میں سب کچھ شامل ہو سکتا ہے یا کچھ بھی نہیں۔ اس کا بنیادی مواد اب بھی بڑی حد تک ثقافتی

انسانیات میں شامل کیا جاتا ہے یا بہرحال اس کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے اور ثقافتی انسانیات عمرانیات سے ناقابل امتیاز ہے۔ عمرانیات اور ثقافتی انسانیات دونوں "ترکیب" کا وظیفہ ادا کرتی ہیں جو بعض اوقات تاریخ کا بے مثل کارنامہ بیان کیا جاتا ہے۔ مزید برآں ہر معلم تاریخ پڑھاتا ہے کیونکہ تمام سائنسی اور فنی کوائف لازمی طور پر تاریخی بھی ہوتے ہیں۔ جو لوگ موسیقی، فنون لطیفہ، طبیعیات، ثقافت، تصورات، سیاسیات وغیرہ کی تعلیم دیتے ہیں وہ لازمی طور پر ان کی اپنی اپنی تاریخ بھی پڑھاتے ہیں۔ "تاریخ" بذاتِ خود کوئی چیز نہیں۔ یہ ہمیشہ کسی نہ کسی چیز کی تاریخ ہوتی ہے۔

تاریخ بلاشبہ بڑے عرصے تک ایک الگ علم کی حیثیت سے جاری رہے گی اور اس حیثیت سے بھی کہ یہ معاشرتی سائنسوں کی ایک اہم معاون ہے اور ان کا لازمی جزو بھی۔ ان سائنسوں کی صحافت، ادب، خطابت اور ڈرامے سے علیحدگی کے بعد، جواب سے بہت پہلے ہونی چاہیئے تھی، تاریخ کے بڑے حصے کی درجہ بندی ادب کے تحت کی جائے گی۔ تاریخ کے معروضی حقائق، جو تمام سائنس کا خام مواد ہیں، درسی نصاب کے معتد بہ حصے کی حیثیت سے جاری رہیں گے۔ اس مواد کی فراہمی اور تشریح سب سائنسوں کا سروکار ہے۔ لہٰذا موجودہ بحث تاریخی مواد پر کوئی بہتان نہیں لگاتی۔ آج کل جو تاریخ کو نصاب میں ایک الگ مضمون کا درجہ دیا جاتا ہے میں صرف اس کی معقولیت پر بحث کر رہا ہوں۔

ظاہر ہے کہ تاریخ کی ان اقسام کا تعلق جن میں اساطیر اور ابلی اسلوب پر زیادہ زور دیا جاتا ہے ادب سے ہے۔ چنانچہ ادب ان کی فنی حیثیت کو زیادہ سے زیادہ تسلیم کرے گا اور اس میں ادب ہی کا فائدہ ہوگا۔ چیچک کا علاج کرنے، زمین میں زرخیزی پیدا کرنے یا حالات حاضرہ پر تبصرہ کرنے کا دعوےٰ ترک کر کے موسیقی اور دوسرے فنون پھلے پھولے ہیں اور زیادہ مستحکم بنیادوں پر استوار ہو گئے ہیں۔ اسی طرح یہ ادب کے لئے بھی مناسب ہوگا کہ وہ نفسیات، معاشیات اور خارجہ پالیسی کی نمائندگی کا کم سے کم دعوےٰ کرے اور خاص طور پر فنی معیاروں کی تخلیق اور ان کے ساتھ مطابقت سے سروکار رکھے۔ بظاہر صدر کلارک کر کے ذہن میں یہی تھا جب اس نے یہ کہا تھا:

"اگر انسیات مر رہی ہیں تو میرے خیال میں یہ قتل کا معاملہ نہیں اور نہ ہی اس کے ارتکاب کا منتظموں پر شبہ کرنا چاہیئے۔ میری رائے میں یہ کئی شعبوں اور یونیورسٹیوں میں خودکشی کی کوششوں کا معاملہ ہے جو ابھی پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی۔ میرے نزدیک انسیت دانوں کی ایک مشکل یہ ہے کہ وہ ایک ایسا کردار ادا کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں جو وہ نہیں کر سکتے۔ وہ سائنس دان بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ بڑے جوش و خروش سے تاریخ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور غیراہم شعرا کے متعلق طرح طرح کے غیراہم کوائف کا کھوج لگاتے ہیں یا وہ نیم سائنسی تنقید کو ترقی دیتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ وہ ایسا کیوں

کرتے ہیں۔ کیا ایسا تو نہیں کہ وہ اس وقار کے حصول کی کوشش کر رہے ہیں جو سائنس سے منسوب ہے اور وہ اس تا یقین کی تلاش میں ہیں جو کسی ایسے علم کی ترقی سے حاصل ہوتی ہے جسے اور کوئی سمجھ نہیں سکتا اور اس لئے اس پر صحیح تبصرہ نہیں کر سکتا ؟ اب انسیات پہلے کی طرح ادب کی تدریس نہیں کرتیں۔ وہ اصلاح اسلوب آیسے اکتا دینے والے کام نہیں کرنا چاہتیں۔ لسانیات کے پروفیسر تک زبان پڑھانے پر رضامند نہیں۔ وہ اپنا سارا زور متنی تنقید کے دقیق نکات پر صرف کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا میرے خیال میں السنیات کو وہ نہیں بننا چاہیئے جو وہ نہیں بن سکتیں۔ انہیں قطعی ہونے کی ضرورت نہیں۔ ان کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ دلچسپ، دل کش اور مسرت بخش ہوں۔ وہ نظری ہو سکتی ہیں اور اقدار سے سروکار رکھ سکتی ہیں اور یوں ہر ایک کے لئے مفید اور کارآمد ہو سکتی ہیں ..... السنیات کا گناہ یہ ہے کہ اب وہ پسندیدہ، شائستہ، اور عزلت گزیں پاک دامن خواتین بننے کی کوشش کر رہی ہیں حالانکہ یہ ان کے لئے بہت بہتر ہوگا اگر وہ پھر اپنے پرانے دلربائی کے طریقے اختیار کر لیں "

اس کا یہ مطلب نہیں کہ فن زندگی کی عکاسی نہیں کرتا یا نہیں کر سکتا اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس عکاسی کی معروضی صداقت کا فیصلہ صرف سائنس ہی کر سکتی ہے۔ اگر انسانی فطرت اور روابط کے متعلق ہمارے خیالات زیادہ تر متداول روایات اور

ادب سے ماخوذ ہیں تو جو فن بھی ان کی تصدیق کردے وہ "کھرا" اور قابلِ اعتبار معلوم ہوتا ہے۔ نفسیات اور عمرانیات پر ادب کے احسانات کی سائنسی صداقت کا ثبوت سائنسی جانچ سے مل سکتا ہے۔ اور یہ ٹھیک، اسی کی ضرورت بھی ہے کیونکہ آج کل معاشرتی روابط کا انصرام ان اصولوں پر کیا جا رہا ہے جنھیں شاعر، ڈرامہ نگار، صحافی، مبلغ اور ریڈیو کے مبصر اپنے زعم میں انسانی فطرت اور روابط کے اصول سمجھتے ہیں اور جنھیں انہوں نے متداول روایات، ادب اور نہایت ہی محدود ذاتی تجربے سے اخذ کیا ہوتا ہے۔ ایسی سائنسی جانچ میں ہومر، شیکسپیر اور بعض دوسروں میں کسی حد تک صداقت ضرور ملے گی جو غالباً اتنی ہی ہوگی جو ان کے جغرافیائی، طبیعیاتی اور حیاتیاتی اظہاروں میں ہے۔ ہم اس سوال پر اگلے باب میں پھر غور کریں گے۔

لہٰذا میرے نزدیک آج کل کی عمومی تعلیم کا معقول مواد یہ ہونا چاہیئے: اول، ان بنیادی لسانیاتی آلات پر قدرت جو سائنس یا فن کی تحصیل کے لئے لازمی ہیں۔ دوم، سائنسی منہاج اور اس کے طبیعیات اور عمرانیات پر اطلاق سے واقفیت۔ سوم، فنون، بشمول ادب، کی پرکھ اور ان میں مہارت۔ علاوہ ازیں یہ تینوں ایک مشترک مقصد کے حصول کے لئے اس طرح مربوط ہونے چاہئیں کہ ان کی نسبتی اہمیت کا سوال پیدا ہی نہ ہونے پائے۔ تپائی کے متعلق یہ سوال بے معنی ہے کہ اس کی کون سی ٹانگ سب سے زیادہ

اہم ہے۔

۳۔ اہم نقائص

دورِ حاضر میں عمومی تعلیم کے مذکورہ بالا تقاضوں کے پیشِ نظر ہمارے موجودہ تعلیمی پروگرام میں بڑے نقائص کیا ہیں ؟

(۱) ہمارے موجودہ تعلیمی پروگرام کا پہلا نقص ایسا ہے جس پر خوش بختی سے ہر ایک، حتیٰ کہ مسٹر ہچنز اور مسٹر ڈیوی بھی متفق ہے۔ میں خود بھی مسٹر ہچنز کی تشخیص حال سے متفق ہوں۔ مجھے صرف اس کے علاج سے اختلاف ہے۔ میں اس سے اتفاق کرتا ہوں کہ ہماری جدید تعلیم میں کسی تالیفی تربیت کا فقدان ہے، جیسے دینیات جس کا انتظام قرونِ وسطیٰ میں کیا جاتا تھا۔ لیکن میں اس کی پرزور مخالفت کرتا ہوں کہ (جیسے بعضوں کا خیال ہے) ایک سو یا زائد "کلاسیکل ادب" کی کتابوں سے ایسی تربیت حاصل ہو سکتی ہے کیونکہ ان میں اس سے زیادہ کچھ نہیں ملتا کہ انسان قدیم زمانے اور ازمنۂ وسطیٰ کی تاریکی میں ٹامک ٹوئیے مار رہا ہے۔ جدید تعلیم کی تالیفی تربیت صرف جدید سائنس ہی میں مل سکتی ہے جو ہر زمانے کے کلاسیکل ادب کا کشید کردہ جوہر ہے۔ سائنس ہر دور کی چھان پھٹک کا ماحصل ہے اور اس کے منہاج صحیح نتائج تک پہنچنے کے موثر ذرائع ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اور اُن میدانوں میں جہاں اسے آزمایا گیا ہے سائنس مسلم اقتدار میں دینیات اور فلسفے سے سبقت لے گئی ہے۔ ہم معاشرتی مظاہر کے متعلق

اپنے خیالات میں ایسی ہی تبدیلی کرنے میں پس وپیش کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقوں میں بھی انتشار، کشمکش اور اختلاف پاتے ہیں۔

(۲) اگر ہم یہ مان لیں کہ سائنسی منہاج کی نمایاں اہمیت کو تسلیم نہ کرنا ہماری پہلی بڑی فروگذاشت ہے تو ظاہر ہے کہ ہمارے تعلیمی پروگرام کا دوسرا بڑا نقص یہ ہے کہ ہم کالج کے طلبا میں بھی اس منہاج کی مبادیات تک کا شعور پیدا نہیں کر سکے۔ میں نے ایک گذشتہ باب میں توجہ دلائی تھی کہ ہم انسانی روابط کے متعلق جس طرح سوچتے، بات کرتے اور عمل کرتے ہیں اس کے پیشِ نظر موجودہ دور کو سائنسی دور کہنا مہمل بات ہے۔ یہ صورت حال کیسے پیدا ہو گئی جب کہ ہماری زندگی کے بعض شعبوں میں سائنس بے حد مقبول ہے، ہماری کئی درس گاہوں میں سائنسی تعلیم کے اچھے سے اچھے انتظامات موجود ہیں اور عوامی مذاکرات میں اس مضمون کو بڑی نمایاں حیثیت حاصل ہے؟

اس کی تین بڑی وجوہات ہیں۔ اول، ہمارا پختہ خیال، جس کا ہم نے پہلے باب میں ذکر کیا تھا کہ سائنس کا سروکار خالصتہً طبیعی کائنات سے ہے اور اس کے منہاجوں کا اطلاق انسانی امور پر نہیں ہو سکتا۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ جہاں طبیعی مسائل کو سائنسی منہاج کے ذریعے حل کرنے کے لئے ہزاروں لیباریٹریاں ہیں انسانی روابط کی تحقیق کے لئے تقریباً کوئی لیباریٹری نہیں؟ کیا انسانی روابط اتنے تسلی بخش ہیں کہ

ان پر توجہ دینے کی ضرورت ہی نہیں ؟ ہماری صنعت، اقلیتی مسائل اور بین اقوامی صورت حال پر ایک نظر اس کا شافی جواب ہے۔ کیا اس کی یہ وجہ ہے کہ جہاں طبعی تحقیق سے بدیہی مادی فائدے حاصل ہوتے ہیں انسانی روابط کی تحقیق سے کوئی بیّن منافع نہیں ہوتا؟ کسی آجر سے پوچھئے کہ مزدوروں کی شورشوں، ہڑتالوں، دربندیوں وغیرہ سے اس کو اور بالآخر ہم سب کو کتنا نقصان ہوتا ہے۔ تو پھر ہم یہ جانتے ہوئے بھی کہ آخر کار اس سے فائدہ ہی ہوگا انسانی روابط کی تحقیق پر چند لاکھ ڈالر خرچ کرنے سے کیوں گریز کرتے ہیں جب ہم کروڑوں ڈالر صنعتی تحقیق پر خرچ کر رہے ہیں؟ اس کا صرف ایک جواب ہو سکتا ہے یعنی ہمیں اس کا ابھی تک یقین ہی نہیں کہ انسانی روابط ایسا موضوع ہے جس پر سائنسی منہاج کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

یہ درست ہے کہ معدودے چند پروفیسر تدریس سے کچھ وقت بچا کر تحقیق بھی کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ کارخانوں میں عملے کے شعبے، ماہرین کارکردگی، معاشرتی کارکن وغیرہ ہوتے ہیں۔ ان میں سے کئی ہوشیار اور لائق ہوتے ہیں لیکن وہ موجودہ حالات میں اتنے ہی بے بس ہیں جتنے کیمیا، عضویات اور جراثیمیات کی ترقی سے پہلے طبیب تھے۔ بیشتر اس کے کہ لوگ دانت نکالنے یا زائدہ کاٹنے کے اہل ہوں ہم ان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ہائی سکول کے بعد سات یا آٹھ سال تک باقاعدہ مطالعہ کریں۔ قوموں کو باہم

دگرد ست وگریباں ہونے سے روکنے کے لئے کوئی بھی نیم سیاست دان کافی ہے۔ لیکن انسانی روابط تبھی بہتر ہوں گے کہ ہم ان کی اصلاح کے طریقے کا سنجیدہ سائنسی مطالعہ کریں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم ٹونوں ٹوٹکوں، دشنام طرازی، پند و نصیحت اور جھاڑ پھونک پر بھروسہ کئے جا رہے ہیں بعینہٖ اس طرح جس طرح ہمارے قبل سائنسی آباؤ اجداد اپنی طبیعی مشکلات کے بارے میں کیا کرتے تھے۔

اس کی دوسری وجہ کہ ہماری درس گاہیں سائنسی منہاج کی واقفیت والے لوگ پیدا کرنے میں کیوں ناکام رہی ہیں یہ ہے کہ اب تک ہمارے درسی فنون کے کالجوں میں بھی طبیعیاتی علوم کو واجبی سی اہمیت دی جا رہی ہے چہ جائیکہ انہیں سکولوں میں درخور اعتنا سمجھا جائے۔ یہ درست ہے کہ باقاعدہ سکولوں اور کالجوں کے باہر صنعتی اور تجارتی اداروں میں بہت زیادہ سائنسی تعلیم دی جا رہی ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ مصنوعی سیاروں اور فضائی سفر پر جو اچنبا ہوا ہے اس سے لوگوں کو بہت زیادہ غور و فکر کی تحریک ہوئی ہے جس کے نتیجے میں موجودہ صورت حالات میں قدرے اصلاح ہو گئی ہے۔ لیکن یہ شور و غوغا جو بعض حلقوں میں اٹھایا گیا ہے کہ سائنس ہماری درس گاہوں کو ہڑپ کر رہی ہے درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری درس گاہوں میں ہر قسم کی سائنسی تربیت ہماری موجودہ ثقافت کے تقاضوں سے ابھی تک بہت پیچھے ہے۔

اس کی تیسری وجہ کہ ہماری موجودہ پود جو سائنس کے مادی جال اور اس کے عواقب میں پھنسی ہوئی ہے سائنسی نقطۂ نظر سے ناخواندہ کیوں ہے وہ سائنسی تربیت ہے جو اسے دی جا رہی ہے۔ سائنس پڑھانے میں خاص موضوعات اور خاص صناعیات میں انہماک کا یہ عالم ہے کہ اکثر طالب علم جو کسی خاص سائنس کی تحصیل کر لیتے ہیں اس سے بے خبر ہوتے ہیں کہ سائنسی منہاج دنیا کے مسائل حل کرنے کا صحیح راستہ ہے۔ عام طور پر سائنس سے ایک خاص موضوع مراد لیا جاتا ہے نہ کہ مطالعے کا ایک طریقہ۔ بعضوں کے نزدیک سائنس کے معنی ہیں ایک شیشے کی نلی میں رنگ دار مائع۔ بعضوں کے نزدیک طبیعیاتی لیباریٹری کا ساز و سامان۔ بعضوں کے نزدیک اصطلاحات کا مجموعہ جس میں ریاضیاتی فارمولے بکھرے ہوتے ہیں۔ یہ تصور کہ سائنس ایک خاص طریق مطالعہ ہے، جس کا اطلاق ہر موضوع پر ہو سکتا ہے، نظر انداز کر دیا گیا ہے کیونکہ ہم زیادہ ترقی یافتہ سائنسوں کے حیرت انگیز انکشافات میں پوری طرح منہمک ہو گئے ہیں۔ لہذا یہ تعجب انگیز نہیں کہ سائنس کا فارغ التحصیل طالب علم سائنسی منہاج کے معنی پہلی بار فلسفے، تاریخ یا عمرانیات کے نصاب میں سیکھتا ہے۔

سائنسی منہاج غالباً فلسفے یا عمرانیات ہی کے نصابوں میں پڑھانا چاہیے کیونکہ سائنس بحیثیت منہاج انسانی بیوہار کی ایک صورت ہے۔ اس کے عناصر یہ ہیں۔

(۱) واضح قابل جواب سوال کرنا۔ (۲) غیر جذباتی اور بے لاگ نقطۂ نظر سے مشاہدہ کرنا۔ (۳) مشاہدوں کو بحدامکان صحیح طور پر قلم بند کرنا، اس طرح سے کہ ان سوالوں کے جواب مل جائیں جو ابتدا میں کئے گئے تھے۔ (۴) کھلی معقول تصورات یا مفروضے جو مشاہدات سے پہلے یا جوابات حاصل ہونے سے پیشتر ذہن میں تھے اُن پر ان مشاہدات کی روشنی میں نظر ثانی کرنا۔ لہذا سائنسی منہاج پڑھانے کا بہترین طریقہ غالباً یہ ہے کہ اسے اُن مضامین کے ضمن میں پڑھایا جائے جو فکر انسانی کی نوعیت اور ترقی سے بحث کرتے ہیں۔ ان میں منطق شامل ہے جو استدلال کے قواعد سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ کیمیا دانوں، طبیعیات دانوں اور حیاتیات دانوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ سائنسی منہاج پڑھائیں بے جا ہے۔ ان میں سے اکثر اس کے اہل بھی نہیں ہوتے۔ ان کے لئے اپنا مضمون پڑھانا ہی بڑی بھاری ذمہ داری ہے۔ اور وہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ اپنے خاص مضمون میں سائنسی منہاج کی اہمیت بتادیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو ظاہر ہے کہ ہم انھیں ایسا کام نہ کرنے کا الزام نہیں دے سکتے جو وہ کرنے کی کوشش ہی نہیں کر رہے یا جو وہ اپنی بھاری ذمہ داری کے پیش نظر کر ہی نہیں سکتے۔

الغرض ہماری درس گاہیں طالب علموں کو سائنسی منہاج کی مبادیات تک کی واقفیت بہم پہنچانے میں ناکام رہی ہیں۔ اگر ہم اس کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ابتدائی سکولوں سے لے کر کالجوں تک میں ایسے نصاب مقرر کرنے ہوں گے جو ہر طالب علم کو سائنسی منہاج کے عمومی معنی کی

واقفیت بہم پہنچائیں۔ اور ہمیں اس منہاج کا حلقۂ اطلاق خاص طور پر انسان کے معاشرتی بیوہار تک وسیع کرنا ہوگا۔

یہاں معاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ نئے نصاب کون پڑھائے گا؟ وہ کس شعبے میں شامل ہوں گے؟ وغیرہ۔ یہ انتظامی تفصیلات کا سوال ہے جس سے بحث کرنا میرے مقصد کے لئے ضروری نہیں۔ میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ دوسرے نصابوں کی طرح یہ نصاب بھی صرف ایسے استاد پڑھائیں جو اس کے سب سے زیادہ اہل ہوں۔ میں اس سے بخوبی واقف ہوں کہ بعض فلسفے کے شعبے عرصے سے سائنسی منہاج کی منطق اور تاریخ پڑھا رہے ہیں، تاریخ اور فلسفے کے شعبے عرصے سے تاریخ تصورات، جس میں سائنس بھی شامل ہے، پڑھا رہے ہیں اور جہاں کہیں عمرانیات والوں کو یہ مضامین پڑھانے پڑے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پڑھانے والا اور کوئی نہ تھا۔ مجھے اس وقت شعباتی انتظام سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن مجھے اس سے بے حد دلچسپی ہے کہ یہ مضمون کسی نہ کسی طرح کہیں نہ کہیں ایسے سب اشخاص کو پڑھایا جائے جو موجودہ دنیا میں اپنے آپ کو خواندہ کہلانا چاہتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ مضمون مناسب طور پر نہیں پڑھایا جا رہا۔

جہاں سائنس کے متعلق بہت سے کوائف کا علم ہوگیا ہے سائنسی انداز فکر نے ابھی ذہنوں میں گھر نہیں کیا۔ اس کا اندازہ اُن کثیر تعداد بظاہر ذہین افراد سے ہوسکتا ہے جو بآسانی پراپیگنڈا اور نیم حکیموں

کے قریب میں آجاتے ہیں۔معاشرتی حوادث کے متعلق عقلی اور سائنسی طور پر سوچنے کی عادت اتنی شاذ ہے کہ نازک صورت حالات میں، جس میں جنگ شامل ہے، سائنسی تربیت یافتہ اشخاص بھی اپنے تازہ حاصل کردہ علم کو خیرباد کہہ دیتے ہیں اور ایک ابتدائی اور جذباتی منہاج اختیار کر لیتے ہیں جسے بچپن کی شرط سازی اور پشتوں کے غیر سائنسی انداز فکر نے ہم میں یوں سمو دیا ہے کہ اس پر غالب آنے کے لئے ہمیں صدیاں درکار رہیں۔ یہی وہ بنیادی اور انتہائی ضروری کام ہے جو ہمارے تعلیمی اداروں کو کرنا ہے۔جس حد تک یہ کام سرانجام دیا جائے گا اتنا ہی ہم اپنی معاشرتی اور طبیعیاتی دنیا پر قابو پائیں گے۔

(۳) ہمارے موجودہ تعلیمی پروگرام کا تیسرا بڑا نقص طالب علموں کو زبان کی نوعیت اور استعمال کا شعور دینے میں ناکامی ہے جس طرح ریاضیات کے تھوڑے بہت علم کے بغیر طبیعیات پڑھانا ممکن نہیں اسی طرح کوئی معاشرتی علم پڑھانا بھی ممکن نہیں جب تک کہ اُس زبان اور منطق کا تھوڑا بہت شعور نہ ہو جو تمام سائنس کے لئے قطعاً لازمی ہے۔ دراصل سائنسی منہاجوں کے ابتدائی سبق منطق اور زبان کے استعمال پر ہونے چاہئیں۔ وہ فرسودہ تفریق جو ذہنی اور طبیعیاتی، مادی اور غیر مادی یا معاشرتی وغیرہ کے درمیان ہے اور جو مختلف سائنسوں کے اتحاد کے راستے میں غالباً سب سے بڑی رکاوٹ ہے اس طرح مٹائی جا سکتی ہے کہ لسانیات اور معانیات

کے میدانوں میں مناسب تربیت دی جاتے۔ ہم ان تمام بے کار بحثوں کو جو آج کل ہمیں مصروف رکھتی ہیں بھول سکتے ہیں اگر ہم اُس زبان کی بغور جانچ کریں جن میں وہ کی جاتی ہیں۔ اس طرح وہ اپنی پیشرو کلامی بحثوں کے ساتھ مل کر ہمیشہ کے لئے فراموش ہو جائیں گی۔

سب سے پہلے میں یہ مطالبہ کروں گا کہ رموز اور علامات کی نوعیت کا مسلم الثبوت علم ہونا چاہیئے۔ اسی طرح اُن قواعد کی نوعیت کا علم ہونا چاہیئے جن کے تحت رموز انسانی مراسلت میں استعمال ہوتی ہیں۔ اس مراسلت میں مربوط اور غیر مبہم طریق پر اظہار خیال، اور استدلال کی قابلیت شامل ہے۔ میرے خیال میں جب ہیجنز نے قواعد زبان، خطابت، منطق اور ریاضیات پر زور دیا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا۔ میں اُس سے حرف بحرف متفق ہوں بشرطیکہ یہ واضح طور پر سمجھ لیا جائے کہ میری مراد مردہ زبانیں، قدیم منطق یا دقیانوسی ریاضیات نہیں بلکہ جدید لسانیات، معانیات اور پچھلے پچاس برس کی منطق اور ریاضیات ہے۔ ان سب کے ارتقا کا بطور تاریخ، اساطیر، جفر، سحر اور توہمات مفید مطالعہ کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے لئے ایک لازمی شرط یہ ہے کہ طالب علم ان موضوعات کے موجودہ ذخیرۂ علم سے واقف ہو۔

مراسلت کے بنیادی طریقوں سے یہ واقفیت عمومی تعلیم کی ایک بنیادی ضرورت ہے اور ہمیں اس پر اصرار کرنا چاہیئے کیونکہ یہ نہ صرف روزمرہ کے توافقوں کے لئے ضروری ہے بلکہ سائنسی علم کے

حصول کے لئے بھی ۔

۴۔ تعلیمی اصلاح پر اعتراضات

ہم موجودہ تعلیم کے تین نقائص پر تبصرہ کر چکے ہیں ۔ (۱) یہ سائنس کو مرکزی اور تالیفی تربیت نہیں سمجھتی ۔ (۲) یہ ایسی تربیت دینے سے قاصر ہے ۔ (۳) یہ تعبیری مراسلت کے فنون تسلی بخش طور پر نہیں پڑھا سکتی ۔ ان نقائص کے تدارک پر بحث کرتے ہوئے میں نے سائنس پڑھانے پر زور دینے کے علاوہ یہ بھی کہا تھا کہ جہاں طبیعیاتی اور معاشرتی علوم دونوں کا انحصار ریاضیات پر ہے معاشرتی علوم کا انحصار بڑی حد تک اور مضامین پر بھی ہے ، یعنی تاریخ کی بعض اقسام ، فلسفہ اور کئی دیگر مضامین کے بعض حصے جنہیں عام طور پر انسیات کے غیر واضح زمرے میں شامل سمجھا جاتا ہے ۔

آیئے اب ہم یہ دیکھیں کہ نصاب کی اصلاحات جو میں نے تجویز کی ہیں ان پر بڑے بڑے اعتراضات کیا ہیں ۔ ان میں سب سے پہلا بعض حلقوں کا یہ مخلصانہ احساس ہے کہ میری تجویز کے ماتحت ان مضامین سے جنہیں رواجاً انسیات کہا جاتا ہے غفلت برتی جائے گی ۔ جیسے میں بتا چکا ہوں یہ ضروری نہیں کہ انسیات معدوم ہو جائیں ۔ ہوگا صرف یہ کہ ان کے روایتی مزاج کی شناخت ہو جائے گی اور ان کی روایتی حیثیت کو تسلیم کر لیا جائے گا ۔

چنانچہ اب اس سے مفر نہیں کہ انسیات کے روایتی مواد کی

جانچ پڑتال کی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس نے سائنس یا فن میں کیا اضافے کئے ہیں۔ جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں اس مواد کا بڑا حصہ مختلف سائنسوں کا معاون بن جائے گا، مثلاً جیسے اب ریاضیات اور تاریخ طبیعیات اس سائنس کے معاون خیال کئے جاتے ہیں۔ انسیات کا باقی ماندہ مواد، یا اس کا وہ حصہ جو اس قابل ہو، فن کی مملکت کو سونپ دیا جائے گا۔ جب یہ عمل پورا ہو جائے گا تو ہم دیکھیں گے کہ جدید تعلیم کے مواد کی درجہ بندی بڑے عمدہ طریقے سے سائنس اور فن کے تحت ہو سکتی ہے۔

میں اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوں کہ اس درجہ بندی کی حیثیت دوسری تمام درجہ بندیوں کی طرح انسان کی سہولت کے لئے وضع کئے ہوئے ایک تصور سے زیادہ ہے۔ انسانی زندگی تو ایک کُل ہے اور اس کی تمام درجہ بندیاں محض تدبیریں ہیں جن سے اس کے مختلف پہلوؤں پر باری باری غور کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔ میں اس سے بھی آگاہ ہوں کہ کس طرح سائنس اور فن ہر مرحلے پر ایک دوسرے سے لاینفک طریقے پر گتھے ہوئے ہیں اور وہ اپنے اعلیٰ مدارج اور گہرے معنوں میں کس طرح ایک دوسرے سے ناقابل امتیاز ہیں۔ لیکن وہ اپنے ادنیٰ اور درمیانہ درجوں میں ضرور قابل امتیاز ہیں۔ یہاں انھیں معروضی معیاروں پر پرکھا جا سکتا ہے اور ان کی مفید درجہ بندی ہو سکتی ہے۔ رمزی بیوہار اور رموز کے استعمال سے اپنے احساسات اور تخیلات کو

دوسروں میں منتقل کرنا فن کار کا کام ہے۔ اس کے برعکس سائنس دان کا نصب العین یہ ہے کہ وہ رموز کو معیاری اور رسمی طریقے پر استعمال کرے تاکہ وہ بیوپار کی غیر ذاتی اور قابل تصدیق تعبیر اور عکاسی کر سکے۔ اور جہاں تک ممکن ہو اپنے ذاتی احساسات کو دخل انداز نہ ہونے دے۔ یہ وہ فرق ہے جو فن کار کی تصویر، گو وہ رنگوں میں کھینچی ہو یا لفظوں میں، اور نیلے چھاپے یا فوٹو کے درمیان ہوتا ہے۔ جب یہ امتیاز واضح ہو جائے تو کوئی غلط فہمی یا نزاع باقی نہیں رہتا۔ انسیات کی حیثیت پر جو آج کل جنگ ہو رہی ہے اس کی وجہ ٹھیک یہی ہے کہ یہ غیر پیمائش شدہ زمین ہے۔ یہ ایک غیر معین خطہ ہے جس میں ہر زمانے کے ذہن پارے بکھرے پڑے ہیں اور جہاں بیش قیمت ٹکڑے بھی ملتے ہیں۔ سائنس یا آرٹ کو اس قیمتی مواد کی تباہی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ تو اسے بچانے اور اس کی درجہ بندی سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

اس کے برعکس اگر تاریخی باقیات کے اس انبار کی وظائفی نقطۂ نظر سے نئی درجہ بندی کر دی جائے تو علم کی ان عجیب و غریب اقسام کا پول کھل جائے جنھیں آج کل خاص وقعت دی جاتی ہے کیونکہ وہ مہذب انسانوں اور اعلیٰ طبقوں کا طرہ امتیاز سمجھی جاتی ہیں۔ انسان کسی چیز کے ساتھ اتنی سختی سے نہیں چمٹتا جتنا اپنی معاشرتی حیثیت کے نشانوں سے۔ لہٰذا بعض حلقوں کی طرف سے میری تجویز کردہ نئی درجہ بندی کی سر توڑ مخالفت ہوگی۔ ریڈیو پروگراموں کے محققوں نے مجھے بتایا

ہے کہ "جواب دیجئے" ("INFORMATION PLEASE")
کے پروگراموں کی غیر معمولی مقبولیت کی ایک وجہ یہ ہے کہ جب کبھی کسی عام سامع کو کوئی جواب معلوم ہوتا ہے تو وہ اپنے آپ کو عارضی طور پر چیدہ ذی فہم، کے زمرے میں شمار کرتا ہے جنہیں سارے جواب آتے ہیں۔ معمائی جدول بھی جزوی طور پر یہی غرض پوری کرتے ہیں۔ جہاں تک تفریح کا تعلق ہے مجھے اس ذہنی جار وب کشی پر کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن مجھے اس پر سخت اعتراض ہے کہ اسے ادبی تعلیم سمجھا جائے۔

امریکی تاریخ سے حد درجے کی ناواقفیت جو وقتاً فوقتاً بے نقاب کی جاتی ہے بڑی حد تک اسی قسم کی ہے۔ امتحانوں کے یہ نتائج اس لئے دلچسپ ہیں کہ ان سے پتا چلتا ہے کہ سکول وہ کچھ پڑھانے میں ناکام رہے ہیں جو وہ پڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ امتحانی نتائج کی اہمیت یہ ہے کہ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ ہم ایسی معلومات سے جو واقعی ضروری ہیں بے بہرہ ہیں۔ لیکن میں اس پر زیادہ خوش نہیں ہو سکتا جب تک کوئی مجھے یہ نہ بتا دے کہ ان میں سے کئی باتوں کا علم ہونا کیوں ضروری ہے۔ ایک چیز لاعلمی سے بھی بدتر ہے اور وہ ہے بہت سی غیر ضروری چیزوں کا علم۔ یا بالفاظ دیگر اپنے علم کو اس لئے مبالغہ آمیز اہمیت دینا کہ وہ ہمارا علم ہے یا اس لئے کہ ماضی میں یہ علم اعلیٰ طبقوں کا حاصہ رہا ہے۔

یہ بہتر ہوگا اگر ہر لشپت اپنے ذہنی ورثے اور تمام مضمونوں کی

جانچ پڑتال اس نقطۂ نظر سے کرے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس ورثے کا کوئی حصہ ترک کر دیا جائے۔ پرانا فرنیچر اور پرانے تصورات دونوں بڑے دل کش ہو سکتے ہیں اور ان سے بڑی جمالیاتی مسرت حاصل ہو سکتی ہے پھر ہمارا ماضی سے رشتہ بھی استوار کر سکتے ہیں جس سے بڑی تسکین ہوتی ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پرانی کرسی پر صحیح لیبل لگا یا جائے تاکہ کوئی اُسے کچھ اور تصور کر کے اس پر بیٹھ نہ جائے جس کا نتیجہ کرسی اور اس کی اپنی تباہی ہو۔

نصاب کی تنظیم نو جو میں نے تجویز کی ہے اس پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس سے تعلیم کا سروکار موجودہ کائنات سے بہت زیادہ ہو جائے گا اور ہم یہ بھول جائیں گے کہ انسانی ثقافت کی جڑیں ماضی میں ہیں، وغیرہ۔ مجھے تو یہ اعتراض بڑا مہمل معلوم ہوتا ہے۔ جدید سائنس تمام زمانوں کی جستجوؤں کا ماحصل ہے۔ اس کی جڑیں قدیم ترین زمانے میں ہیں۔ لیکن ہم طالب علم کو تاریخ انسانی کی تمام ٹیڑھی سیدھی بند گلیوں میں کیوں لے جائیں پیشتر اس کے کہ وہ ان کی شناخت کی اہلیت حاصل کرے؟ بعض میدانوں میں ہم اس کی لغویت کے قائل ہیں۔ مثلاً ہم قدیم یونان یا قرون وسطی کی کیمیا، طبیعیات اور حیاتیات نہیں پڑھاتے پیشتر اس کے کہ طالب علم ان مضامین کے موجودہ ذخیرۂ علم سے واقف ہو جائیں۔ اگر کوئی کیمیا، طبیعیات اور حیاتیات کے متعلق قرون وسطی کے طریقے پر بات کرنے لگے تو ہم اسے تفنن

کی نظر سے دیکھیں گے۔ لیکن اور میدانوں میں اسی فرسودہ قسم کی تقریریں سنجیدگی سے سنی جاتی ہیں یہاں تک کہ وہ جدید علم سے زیادہ باوقار سمجھی جاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ ایک عام نفسیاتی مرض ہے۔ ایرک ٹمپل بل نے خوب کہا ہے کہ "اگر کسی قابلِ تردید موقف کی تائید میں استادانِ قدیم کی سی حیرت انگیز چابک دستی کے ساتھ دلائل پیش کی جائیں تو صرف ایک غیر معمولی چوکنا شخص ہی اپنا ذہنی توازن برقرار رکھ سکتا ہے۔ استادانِ قدیم نہیں جانتے تھے کہ وہ غلط بیانی کر رہے ہیں۔ لیکن وہ بہرحال غلط بیانی کرتے تھے گو بے نظیر قابلیت کے ساتھ۔"

میں نے تاریخ کے متعلق بھی صرف یہی کہا ہے۔ ہمیں تاریخ سے مفر نہیں نہ ہی ہم اس سے بچنا چاہتے ہیں کیونکہ جتنے واقعات رونما ہوتے ہیں، یہاں تک کہ کل کا کیمیاوی تجربہ بھی، سب کے سب تاریخ ہیں۔ تاہم آپ دیکھیں گے کہ جب دوسری سائنسیں طبیعیاتی کائنات کی تاریخ مرتب کرتی ہیں تو وہ قدیم دستاویزات کو رجوع کرنے کی بجائے اپنے موضوع پر معاصر سائنس کی روشنی ڈالتی ہیں۔ ان واقعات کی بنا پر جو رونما ہو رہے ہیں طبیعیات دان یہ کہہ سکتے ہیں کہ کیا واقعات رونما ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ ماضی میں کیا واقعات رونما ہوتے ہوں گے۔ اور یہی ہے طبیعیاتی کائنات کی تاریخ۔ اس کے برعکس ہم سمجھتے ہیں کہ بعض اقسام کی شراب اور پنیر کی طرح تاریخ انسانی جتنی پرانی ہو اتنی ہی اچھی ہوتی ہے۔ جب معاشرتی علوم ترقی کر جائیں گے

تو یہ نقطۂ نظر تبدیل ہو جائے گا۔

بعض اقسام کے ذہنوں کے لئے قدیم کتابوں میں بڑی دل کشی ہوتی ہے۔ اس ضمن میں ایک بات کبھی پوری طرح واضح نہیں کی گئی۔ یہ باصرار کہا جاتا ہے کہ غائر اور طبع زاد غور و فکر کی اہلیت صرف مخصوص کلاسیکل کتابوں ہی سے حاصل ہو سکتی ہے لیکن یہ حقیقت نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ ان کتابوں کے مصنفوں نے یہ شاندار تصانیف مرتب کر لیں یا وجود یکہ ان کے پاس کوئی "کلاسیکل کتابیں" نہ تھیں۔ لہذا یہ کہنا درست نہیں کہ اگر ہمیں کلاسیکل کتابوں کے مصنفوں جیسے دماغ پیدا کرنے ہیں تو ان کتابوں کا مطالعہ لازمی ہے۔ کیونکہ خود ان مصنفوں کے پاس کوئی ایسی کتابیں نہ تھیں۔

تو کیا ہم کلاسیکل ادب کے بغیر کام چلا سکتے ہیں؟ اس پر صدر جیفرسن کے اظہار سے روشنی پڑ سکتی ہے۔ اس نے ۱۸۲۶ء میں اپنی وفات سے کچھ دیر پہلے "اعلان آزادی" کے مرتب کرنے کے متعلق کہا تھا:

"ہمیں نہ پھپھوندی لگی مسلیں پڑھنے کی ضرورت تھی، نہ شاہی دستاویزوں کا کھوج لگانے کی، نہ ہم نے متمدن اسلاف کے قوانین اور اداروں کی چھان بین کی۔ ہم نے صرف قوانین فطرت کی جستجو کی اور انہیں لوحِ دل پر کندہ پایا۔"

لیکن میں نے شاید غلطی کی کہ جیفرسن کے افکار کو کلاسیکی پائے

کے افکار میں شامل کر دیا۔ تو ملاحظہ فرمایئے جیفرسن کی ایک ایسی کلاسیکل کتاب کے متعلق رائے جس کا موضوع اس کا اپنا خاص شغل یعنی حکومت تھا۔ اس نے ایک خط مورخہ ۵ جولائی ۱۸۱۴ء جان ایڈمز کو لکھا:

"میں نے افلاطون کی "ریاست" کے سنجیدہ مطالعے سے دل بہلایا۔ لیکن "دل بہلایا" کہنا غلطی ہے کیونکہ میرے لئے یہ سب سے زیادہ کٹھن کام تھا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی کبھی اس کی بعض تصنیفیں دیکھی تھیں لیکن کوئی پوری کتاب پڑھنے کی ہمت نہ پڑی تھی۔ اس کتاب کی مخبوط الحواسیاں، طفلانہ خیالات اور ناقابلِ فہم لسان پڑھتے پڑھتے میں نے اسے کئی دفعہ رکھ دیا اور اپنے آپ سے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ دنیا ان لغویات کو اتنی شہرت دینے پر رضامند ہو گئی ۔۔۔۔ لیکن رواج اور اقتدار کو برطرف رکھیئے اور افلاطون کو عقل کی عدالت میں پیش کر کے اس سے اس کی باطل دلائل، بے معنی اظہارات اور مہمل اقوال چھین لیجئے تو باقی کیا رہ جائے گا؟ ۔۔۔۔ اس کا دھندلا دماغ چیزوں کو ہمیشہ کہرے میں سے دیکھتا ہے چنانچہ وہ اسے مبہم نظر آتی ہیں اور وہ ان کی ایسی شباہتیں پیش کرتا ہے جن کی صورت معین ہو سکتی ہے نہ جسامت۔ لیکن اس کی یہی خصوصیت جس کی وجہ سے اسے جلد ہی گوشۂ گمنامی کے سپرد کر دینا چاہیئے تھا اسے دوامی شہرت اور عظمت عطا کرنے کا باعث ہوئی ۔۔۔ حضرت مسیحؑ کے منہ سے نکلی ہوئی وصایا تو ایک بچے تک کی سمجھ میں آسکتی ہیں لیکن ہزاروں کتابیں بھی ان افلاطونیات کی تشریح نہیں کر سکیں جو بچوں

پر تھوپی جارہی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان لغویات کی تشریح کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔"

الغرض کلاسیکل کتابوں پر، جن معنوں میں ہم انہیں سمجھتے ہیں، کسی کو کوئی اعتراض نہیں۔ دراصل پیشِ نظر کتاب کا موضوع ہی یہ ہے کہ انسانی بیوطار پر زیادہ اور بہتر کلاسیکل کتابیں لکھی جانی چاہئیں۔ لیکن ہم یہ ضرور کہیں گے کہ ایسی کلاسیکل کتابیں صرف طویل اور محنت طلب تحقیق کے بعد ہی لکھی جاسکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اُس وقت تک ہمیں انہی کتابوں پر اکتفا کرنا ہوگا جو ہمارے پاس ہیں۔ بہرحال اس پر سب کا اتفاق ہے کہ گو مروجہ کلاسیکل کتابیں، جن کا اتنا احترام کیا جاتا ہے، صدیوں سے ہمارے پاس ہیں ہمیں معاشرتی روابط کے انصرام میں کوئی نمایاں کامیابی نہیں ہو رہی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہماری فی الواقع نمایاں کارگزاریاں یعنی وہ جو ہم نے طبیعیاتی علوم میں کی ہیں، قدیم کلاسیکل کتابوں کی نہیں بلکہ موجودہ لیبارٹیریوں کے نتائج کی مرہونِ منت ہیں۔

۵۔ تعلیمی تنظیم اور صناعیات

ہم نے عمومی تعلیم کے مواد اور میری تجویز کردہ تبدیلیوں کے بارے میں اعتراضات پر کافی غور کر لیا ہے۔ اس کے بعد تدریس اور تعلیمی بندوبست کے موضوع کی طرف رجوع کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس بیکراں اور دھندلے میدان کی تفتیش کرنا پیشِ نظر تصنیف کی حدود سے باہر ہے۔ لہٰذا ہم چند عمومی ملاحظات پر اکتفا کریں گے۔

ظاہر ہے کہ ہم پرانے رسمی طریقوں کے مطابق تعلیم کے لئے زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرتے رہیں گے۔ ہم سکولوں کے لئے بہتر عمارتیں تعمیر کریں گے، استادوں کو بہتر تربیت دیں گے، انہیں زیادہ معاوضہ ادا کریں گے، وغیرہ۔ لیکن اگر ہمیں بقول ویلز "تعلیم اور تباہی کی دوڑ" میں زیادہ کو جانا ہے تو ہمیں عوام تک پہنچنے کے لئے نئے اور موجودہ طریقوں سے زیادہ کارگر طریقے اختیار کرنے ہوں گے۔ خوش قسمتی سے صناعیاتی ترقیاں ہمیں صحیح راستہ دکھا رہی ہیں۔ عمومی تعلیمی نظام کی نگرانی میں اور اس کے ایک پہلو کے طور پر ریڈیو، ٹیلی ویژن، سینما اور فوٹو تعلیمی مقاصد کے لئے زیادہ سے زیادہ استعمال ہونے لگیں گے۔

ظاہر ہے کہ ادنیٰ سکول ذاتی اور جماعتی تدریس کو بڑی اہمیت دیتے رہیں گے کیونکہ فرد کو معاشرے کے سانچے میں ڈھالنے کا عمل کم از کم ابتدائی مراحل میں راست ارتباط کے بغیر ممکن نہیں۔ لیکن جیسے ہم کالج اور یونیورسٹی کے قریب پہنچتے جاتے ہیں ہمیں تقریر کی بجائے تحریر پر زیادہ تکیہ کرنا ہوگا۔ دراصل اگر ہم لوگوں کو (۱) پڑھنا سکھا دیں اور (۲) ان میں کائنات کے تجسس کا مستقل اشتیاق پیدا کر دیں تو تعلیم کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہو جائے۔ جب بھی لائبریریاں، مطالعے کے رہنما اور لبارٹیریاں مہیا کرنی پڑیں گی لیکن جب یہ مہیا ہو جائیں تو دنیا بھر کا علم ہر اس شخص کی دسترس میں ہوگا جو پڑھ سکتا ہے اور جو حصول علم کا مشتاق ہے۔ اب رہا سوال ان کثیر تعداد اشخاص کا جو کسی

معلوم طریقے سے پڑھنا نہیں سیکھ سکتے تو ہمیں ان کو ایسے موضوع سکھانے کا قصد ہی نہیں کرنا چاہیئے جن میں پڑھنا درکار ہو۔ ہم تدریس کے ان طریقوں پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کرتے ہیں جو کبھی فرسودہ ہو گئے تھے جب مطبوعہ تحریر کی وسیع اشاعت ممکن ہوئی تھی۔ ایسا لکچر سننے پر ایک گھنٹہ صرف کرنا تضییع اوقات ہے جس کا لب لباب ایک باقاعدہ تربیت یافتہ شخص پندرہ منٹ کے مطالعے سے بہتر اخذ کر سکتا ہے۔ اس کے باوجود لکچر سننے کی عادت جاری ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ اول یہی کہ یہ عادت ہے۔ اور دوسری یہ کہ اکثر لوگوں نے ابھی تک آسانی اور درستی سے پڑھنا نہیں سیکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثر لوگ ایسے خیالات زیادہ آسانی سے قبول کرتے ہیں جن کا اظہار کوئی شخص سٹیج پر کھڑا ہو کر زبانی کرتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک ڈرامائی تدبیر ہے جس میں ڈرامے کی سب دلکشیاں موجود ہوتی ہیں۔ تاہم یہ سیدھے سادے اظہار کا ایک بھونڈا طریقہ ہے جس میں وقت ضائع ہوتا ہے اور یہ مناسب ہوگا کہ پڑھنا زیادہ سے زیادہ اس کی جگہ لے لے۔

لوگوں کو پڑھنا سکھانا اتنا مشکل کیوں ہے؟ ابتدائی سکول کے آٹھ سال زیادہ تر اسی کے لئے وقف ہوتے ہیں۔ ہائی سکول کے چار سالوں میں بھی اس پر بہت توجہ دی جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود لوگ کالج میں پہنچنے اور وہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد تک بھی مطبوعہ تحریر سے علم اخذ کرنے کی صلاحیت یا میلان یا دونوں سے عاری

ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ جن کے پاس قیمتی خیالات ہیں انہیں بھی تربیت دینی چاہیئے تاکہ وہ ایسی تحریر کے قابل ہوجائیں جو کم سے کم کوشش سے قاری کی سمجھ میں آجائے۔ چنانچہ جو شخص لوگوں میں تجسس کا مستقل اشتیاق پیدا کرنے میں کامیاب ہوگا اور انہیں صحیح طور پر پڑھانے کا طریقہ دریافت کرے گا وہ سب سے زیادہ ہماری تعلیم میں انقلاب کا باعث ہوگا۔ تعلیمی تعمیر نو کے تدریسی پہلو کا یہ انتہائی اہم اور مشکل مسئلہ ہے۔

اگر لوگ صحیح طور پر پڑھنے کے قابل ہوجائیں تو مراسلتی مطالعے کا نظام تمام آبادی میں جاری ہوسکتا ہے۔ ریڈیو سے بھی یہ نتیجہ حاصل ہوسکتا ہے لیکن مقابلتہً بہت وقت ضائع کرنے سے کیونکہ بہت سے اہم مواد کا زبانی ابلاغ تسلی بخش طور پر نہیں ہوسکتا۔ یہ ایک وجہ ہے کہ ہمیں سیاہ تختوں، نقشوں اور جدولوں کی کیوں ضرورت رہتی ہے۔ ٹیلی ویژن بھی اس مسئلے کا حل ہوسکتا ہے لیکن اس میں بھی یہ بنیادی خامی رہ جاتی ہے کہ زبانی ابلاغ مقابلتہً زیادہ وقت لیتا ہے۔

اس ضمن میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک دو لفظ گول میز کانفرسوں' دانشی گروہوں اور مذاکراتی اجتماعوں کے متعلق بھی کہے جائیں جو اتنے مقبول ہیں اور جن سے خاص کر تعلیم بالغاں کے سلسلے میں اتنی توقع رکھی جاتی ہے۔ ان کا اثر زیادہ تر ان کے ڈرامائی اور تفریحی پہلوؤں سے ہے۔ فرصت اور تفریح کی تعلیم سے جو افسوس ناک بے توجہی برتی

جارہی ہے اس کے پیش نظر یہ بات خاص طور پر بڑی اہم ہے لیکن اس وجہ سے کہ تفریح حصول علم کا ایک اہم ذریعہ اور لازمہ ہے ہمیں اسے خود علم نہیں سمجھ لینا چاہیئے کیونکہ جہاں تفریح ہمارے جذبات اور رجحانات کی تسکین کرتی ہے علم بسا اوقات ہم سے اپنے عزیز ترین اعتقادات ترک کرنے کا مطالبہ کرتا ہے "تالار بلدیہ" کی مجالس کا مقصد عام طور پر اس سے زیادہ نہیں ہوتا کہ لوگوں کو اکٹھا ہونے کی سہولتیں دے کہ انہیں اپنے رجحانات کے حق میں عوامی مظاہرہ کرنے کا موقع بہم پہنچایا جائے۔ میں ایسی مجالس کے خلاف نہیں ہوں جیسے میں کھیلوں کے خلاف نہیں ہوں اور جہاں تک تفریح اور عوامی جلسوں کے آداب کی تربیت کا تعلق ہے میں ان کی اہمیت سے انکار بھی نہیں کرتا۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان سے کوئی بڑی تعلیمی توقعات نہیں رکھنی چاہئیں۔

الغرض نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیم کو دو بڑے مسائل کا سامنا ہے۔ (۱) جہاں تک انسانی امور کا تعلق ہے سائنسی منہاج کی اہمیت اور نوعیت کا شعور عوام میں کس طرح جلد از جلد پیدا کیا جا سکتا ہے؟ (۲) یہ یقین کہ یہی واحد موثر منہاج ہے عوام میں کس طرح جلد از جلد پیدا کیا جا سکتا ہے؟ انجام کار ہمیں ابتدائی اور ہائی سکولوں پر توجہ کرنی ہوگی کیونکہ انہی کے ذریعے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک رسائی ہو سکتی ہے۔ لیکن ہم سکولوں تک بھی استادوں ہی کی معرفت پہنچ سکتے ہیں اور صرف ایسے استادوں ہی سے نصاب اور طریقۂ تعلیم کی سائنسی تشکیل کی توقع ہو سکتی ہے جو خود سائنسی نقطۂ نظر کا

علم رکھتے ہوں۔ چنانچہ میں اس سے آغاز کروں گا کہ استادوں کو سائنسی منہاج کی زیادہ تسلی بخش تربیت دی جائے قطع نظر اس سے کہ انہیں کون سا مضمون پڑھانا ہوگا۔ دوسری ضرورت ایک ایسی عمرانیات کی ہے جو اس عمرانیات سے زیادہ مکمل اور مختلف ہو جو آج کل پڑھائی جاتی ہے۔ ان تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ہمیں تعلیم بالغان کا پروگرام بھی مرتب کرنا چاہیئے جس کا منشا عوام میں بھی یہی تبدیلیاں پیدا کرنا ہو تاکہ وہ سکولوں میں ویسی ہی تبدیلیوں کی تائید اور ان کا مطالبہ کریں۔

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ لبارٹیریاں تمام تعلیم کا سرچشمہ ہیں۔ اگر تعلیم کو محض نمود علم نہیں بن جانا ہے اور اگر ہمارے سکولوں کو مردہ اور غلط علم کا خردہ فروش نہیں بن جانا ہے تو ہر میدان علم میں تحقیق اور دائمی تفتیش اور جانچ پڑتال جاری رہنی چاہیئے کیونکہ صرف اسی طرح حقیقت کا انکشاف ہو سکتا ہے۔ سرچشمے جس حد تک تازہ رکھے جائیں گے اور ان کے پانیوں میں اضافہ کیا جائے گا اسی حد تک ان میں سے نکلنے والے چشمے ہر بستی اور گھر میں جہاں وہ پہنچتے ہیں روحانی غذا، تسکین اور امنگ پہنچا سکیں گے۔

باب - ۵

سائنسی دنیا میں فنون، ادب اور روحانی زندگی

۱۔ کیا سائنس خطرہ ہے؟

اکثر لوگ گذشتہ ابواب میں اظہار کردہ خیالات کی تائید کرتے ہیں۔ وہ مختلف میدانوں میں سائنس کی کارگزاریاں تسلیم کرتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ اس میں امورِ انسانی کے انصرام کے امکانات ہیں تو وہ متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن انہیں یہ خیال مضطرب کرتا ہے کہ اگر انسانی امور کے میدان میں سائنس کا عمل دخل ہوگیا تو ہم زندگی کے بعض ایسے تجربوں اور لمحوں سے محروم ہو جائیں گے جن پر زندگی کی بلند ترین اقدار کا دارومدار ہے یہ تجربے عام طور پر جمالیاتی، فنی اور روحانی امور سے مربوط خیال کئے جاتے ہیں۔ یہ زندگی کے ان پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں جن کا چرچا بجا طور پر گیتوں، افسانوں، شاعری، موسیقی، مصوری، رقص اور دیگر

فنون اور مذہبی رسوم میں کیا گیا ہے۔ اگر انسانی امور پر سائنس کے اطلاق کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم ان عزیز ترین تجربات سے محروم ہو جائیں تو یہ اُن چیزوں کی جو سائنس ہمیں دے سکتی ہے ناقابلِ برداشت قیمت ہوگی۔ لہٰذا یہ سوال انتہائی گہرے غور و خوض کا مستحق ہے۔

بعض اوقات انسانی زندگی پر سائنس کے اطلاق کے نتائج پر بڑی مبالغہ آمیز آرا کا اظہار کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم عہدِ وکٹوریہ کے ایک ناول نویس جارج گِسنگ کا قول نقل کرتے ہیں:

"میں سائنس سے نفرت کرتا ہوں اور اس سے خائف ہوں کیونکہ میرا یقین ہے کہ اگر ہمیشہ کے لئے نہیں تو بڑے عرصے تک یہ انسان کی بے رحم دشمن رہے گی۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ زندگی کی تمام سادگی اور مروت اور حسن کو غارت کر رہی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ تہذیب کے بھیس میں بربریت کو بحال کر رہی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ انسان کے ذہن پر تاریکی کا پردہ ڈال رہی ہے اور اس کا دل پتھر بنا رہی ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ ان گنت تنازعوں کا دور شروع کر رہی ہے جس کے سامنے "زمانہ قدیم کی ہزار جنگیں" ماند پڑ جائیں گی اور جو غالباً انسان کی تمام گاڑھے پسینے کی کارگزاریوں کو بے نظمی کے خونی سمندر میں غرق کر دے گا۔"

ایسے ہی نقطۂ نظر کی ایک اور مثال جرمن مفکر شیلنگ کی یہ رائے ہے کہ "سائنس تحقیقِ فطرت کا اندھا اور نامعقول طریقہ ہے جو اُس

وقت لائج ہوا جب فلسفے میں بیکن نے اور طبیعیات میں بوائل اور نیوٹن نے فساد ڈالا ۔"

آج کل غالباً کم ہی ایسے مصنف، فن کار یا مبلغ ہوں گے جن کی یہ رائے ہو۔ میں مانتا ہوں کہ اس بحث مباحثے کے دوران میں جو اوائل بیسویں صدی میں نظریہ ارتقا کے متعلق چھڑ گیا تھا سائنس کی مذمت میں طول طویل باتیں کہی گئی تھیں۔ لیکن یہ طوفان جلد ہی تھم گیا۔ دراصل سائنس کے خلاف کوئی مہم چلانے کا وقت گزر چکا تھا۔ نئے انداز ہائے فکر اور نئے انداز ہائے عمل کی مزاحمت کی تاریخ سے سب واقف ہیں۔ فطری سائنس اور صناعیات کی بیشتر پیش قدمیوں کو اس مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اب اس پر عام اتفاق ہے کہ یہ ترقیاں، خاص کر طبیعی دنیا میں، انسان کے لئے بڑی سود مند ثابت ہوئی ہیں۔

ان تمہیدی مثالوں سے، یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ معاصر ناول نویس، فلسفی یا مبلغ بحیثیت مجموعی سائنس کے ساتھ معاندانہ رویہ رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس سائنس کے بعض سب سے زیادہ گرم جوش حامی ادیبوں، فن کاروں اور فلسفیوں ہی میں ملیں گے۔ اور یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ شاعروں نے سائنس اور سائنسی نقطہ نظر میں انسانی روح اور جسم دونوں کی آزادی دیکھی ہے۔ جہاں تک تنقید کا تعلق ہے معاصر ادبی نقطہ نظر جوزف وُڈ کرچ کے اس قول سے ظاہر ہوتا ہے،

"ہم لیبارٹری سے مایوس ہو گئے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ ہمیں اس

کی دریافتوں کی صداقت پر اعتماد نہیں رہا بلکہ اس لئے کہ ہمیں اب یقین نہیں رہا کہ اس کی دریافتیں ہمارے لئے اتنی مفید ہو سکتی ہیں جتنی ہمیں کبھی توقع تھی۔"

بظاہر رابرٹ ہچنز کی تشویش کا باعث بھی یہی ہے جب وہ اپنے بیان میں، جس کا میں نے پہلے باب میں حوالہ دیا تھا۔ ڈرامائی انداز میں کہتا ہے کہ "دنیا بیک وقت دو مخالف مقامات پر پہنچ گئی ہے۔ یعنی معلومات، صناعیات اور فطرت پر استیلا کی سمت الراس اور اخلاق اور سیاسی انحطاط کی سمت النظیر۔ غالباً لوگوں کو کیمیائی لبارٹری سے توقع تھی کہ وہ کوئی ایسا پلاسٹک، دوا یا اکسیر مہیا کرے گی جس سے نسلی اور ثقافتی امتیازات محو ہو جائیں گے اور عدم رواداری، حسد اور حرص رواداری اور اخوت میں تبدیل ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ ان کی ایسی امیدوں کے لئے مایوسی مقدر ہے۔ جن نتائج کے وہ متمنی ہیں ان کی تلاش لبارٹریوں میں بے سود ہے۔ انسانی روابط کی اصلاح کا علم صرف عمرانیات ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔"

گذشتہ ابواب میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ توقع معقول ہے اور اکثر لوگوں کا اتفاق ہے کہ اسی میں فلاح کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ لیکن ان کے ذہنوں میں یہ بات واضح نہیں، اور وہ اس پر متردد ہونے میں حق بجانب ہیں کہ اگر انسانی امور کے متعلق سائنسی نقطۂ نظر اختیار کیا جائے تو فنون اور مذہب پر اس کا کیا اثر ہوگا۔ اور سب سے زیادہ وہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اقدار اور ہماری تمام جدوجہد کے مقاصد سے

سائنس کا کیا رشتہ ہوگا ۔

۲۔ سائنس اور جمالیاتی زندگی

یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میرے نقطۂ نظر کے مخالفوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جائے کیونکہ ان کا محاذ متحد نہیں اور وہ سائنس کی مخالفت کی وجوہات پر متفق نہیں ہیں ۔

تو اول وہ لوگ ہیں جن کے مستقل مفادات روایتی اقتدار سے وابستہ ہیں جنہیں مثلاً نسلی سائنس دھمکی دے رہی ہے ۔ یہ وہی پرانا جانا پہچانا قصہ ہے ۔ یعنی جادوگر اور سائنس دان ، سیانے اور طبیب کی کشمکش ۔ اگر کوئی عمرانیات دان صحافی اور سیاست دان کی راہ میں حائل ہو تو وہ اس کا یہ کہہ کر مذاق اڑاتے ہیں کہ وہ "دانشی توبیت کا قائل ہے" فلسفی ، تاریخ دان ، ادیب اور کلاسیکل عالم بھی بعض اوقات عمرانیات دانوں کو دخل درمعقولات کا الزام دیتے ہیں ۔ پرانی وضع کا مبلغ خیال کرتا ہے کہ دماغی معالج ، نفسیات دان ، ادیب اور معاشرتی کارکن اس کے اپنے میدان عمل یعنی دماغ اور نفس اور روح کے معالجے میں دخل اندازی کر رہے ہیں ۔ البتہ روشن خیال مبلغ ان ماہرین خصوصی کی قدر کرتا ہے اور انھیں اپنے ہی خواہوں کے زمرے میں شامل کر لیتا ہے ۔ اس کے علاوہ وہ خود بھی ان میدانوں میں تربیت حاصل کرتا ہے ۔

علم کی توسیع اور اس سے پیدا شدہ خصوصی مہارتیں صورت حال کو اور پیچیدہ بنا دیتی ہیں ۔ ایک زمانہ تھا جب عظیم فلسفی بیک وقت عظیم شاعر ،

عظیم منجم اور غالباً عظیم طبیب اور عظیم سپاہی بھی ہوتا تھا۔ آج ہر میدان میں اتنی ترقی ہو چکی ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی ایک یا چند سے زیادہ میں امتیاز حاصل نہیں کر سکتا اور بہت کم ایسے اشخاص ہوں گے جو لیونا رڈو یا سر فلپ سڈنی کے سے کمالات کی آرزو رکھتے ہوں۔ لیکن بعض حلقوں میں یہ احساس اب تک موجود ہے کہ انسانی روابط پر عمرانیات دان نہیں بلکہ شاعر، فلسفی، ناول نویس اور کلاسیکل عالم ہی سند ہیں۔ جیسا ہم دیکھ چکے ہیں سائنس کسی ایسے علم کی تحقیر نہیں کرنا چاہتی اور نہ ہی اسے ترک کرنا چاہتی ہے۔ لیکن سائنس کی طرف رجوع کرنے کے عبوری دور میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سائنس ادبی دنیا کی روایتی اجارہ داریاں غصب کرنا چاہتی ہے۔ جہاں تک یہ خیال منفی ردعمل کا باعث ہے یہ مسئلہ وہی ہے جو کسی اور میدان میں اجارہ داریوں کا ہے۔

سائنس کے نکتہ چینیوں کا دوسرا گروہ وہ ہے جو صناعیات اور صنعت کے مکروہ، غیر اخلاقی اور مخرب صحت لوازم سے آزردہ ہوتا ہے۔ اس آزردگی کی مختلف وجوہ ہو سکتی ہیں، مثلاً صناعیاتی ترقی کے نتیجے میں ملازمت کا جاتے رہنا، پیشہ ورانہ امراض، جمعیت بندی، جدید جنگ کی تباہ کاریاں وغیرہ۔ سائنس کے نکتہ چینیوں کا یہ گروہ محسوس کرتا ہے کہ سائنس اور اس کی مخلوق مشین نے انسانی زندگی کی قدر گھٹا دی ہے۔ اسے ایک ہی سانچے میں ڈھال کر اس کی انفرادیت مٹا دی ہے۔ اور اسے مشین صفت بنا دیا ہے۔ لہٰذا وہ کھیت اگاؤں اور دکانِ دست کاری کی

طرف رجعت کی سفارش کرتے ہیں۔ سائنس داں ان نکتہ چینیوں کو صرف یہی جواب دے سکتے ہیں کہ ان حالات کی وجہ جن کی تم شکایت کر رہے ہو یہ ہے کہ تم نے انسانی روابط پر سائنس کا اطلاق ہی نہیں کیا اور سائنس کو اس کے بے جا استعمال اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ جہاں تک قبل صنعتی دور کو رجعت کا سوال ہے اس کے متعلق یہی کہنا کافی ہے کہ اکثریت اس کی حمایت نہیں کرے گی کیونکہ اس تجویز کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ موجودہ آبادی کے معتد بہ حصے کو بھوکوں مار دیا جائے اور باقی ماندہ حصے کے معیار زندگی کو گھٹا دیا جائے۔

آخر میں وہ تیسرا گروہ ہے جو مذکورہ بالا گروہ سے قریبی مشابہت رکھتا ہے۔ اس میں زیادہ تر فن کار، ادیب اور عالمان دین شامل ہیں جو سائنس کو اس لئے ناپسند کرتے ہیں کہ اس نے انسان کی تحقیر کی ہے کیونکہ وہ اسے اشرف المخلوقات اور روحانی مخلوق نہیں سمجھتی۔ یہ نقطہ نظر زیادہ تر جذباتی ہے لیکن یہ فی الواقع اس احساس کی نمائندگی کرتا ہے کہ میرے اختیار کردہ موقف کا نتیجہ زندگی کو اس کے بیش بہا لمحوں سے محروم کرنا ہوگا۔ چنانچہ اگر ہم اس اعتراض کا شافی جواب نہ دے سکیں تو انسانی روابط پر سائنس کے اطلاق کا کوئی جواز نہیں رہے گا۔

یہ نکتہ چین سائنس کے بے لاگ، غیر ذاتی اور غیر جذباتی طریقوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ وہ احساس اور جذبے کی مدد سے فطرت کے ساتھ

زیادہ ذاتی رابطہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا نقطہ نظر والٹ وٹمن کی مندرجہ ذیل نظم سے ظاہر ہوتا ہے :

جب میں نے سنی باتیں ذی علم منجم کی
جب پھیلے مرے آگے اعداد و شمار اپنی ترتیبوں کے خانوں میں
جب دیکھے کئی نقشے اور شکلیں جو کام آئیں پیمانوں کی صورت میں
جب بیٹھے ہوئے میں نے ذی علم منجم کی تقریر سنی جس پر تقریر کے کمرے میں داد اس نے بہت پائی۔
معلوم نہیں کیونکر میں جلد ہی تنگ آیا، بے زار ہوا جی سے
پھر اٹھا، چلا آیا اور پھرنے لگا تنہا
اک بھیگی ہوئی شب کی پراسرار ہواؤں میں
اور تکتا رہا کامل خاموشی سے تاروں کو

اِن اور ان جیسی سینکڑوں اور سطور سے جو نتیجہ بعض لوگ اخذ کرتے ہیں یہ ہے کہ بیچارا زمین بستہ سائنس دان کبھی "پراسرار شب کی بھیگی ہوا" میں گھوم نہیں سکتا اور نہ کامل خاموشی سے ستاروں کو تک سکتا ہے۔ یا کم از کم اگر وہ انہیں دیکھتا بھی ہے تو اس کی روح میں کوئی ارتعاش پیدا نہیں ہوتا۔ نکتہ چینیوں کے اس گروہ کو یہاں تک بھی اندیشہ ہوتا ہے کہ سائنس کی ترقی سے ہر شخص ستاروں کو مناسب جذباتی قدر دانی سے دیکھنے کے ناقابل ہو جائے گا۔

اس گروہ کے اعتراضوں کا جواب دینا قدرے دشوار معلوم ہوتا

ہے کیونکہ یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ٹھیک کیا چیز اسے پریشان کر رہی ہے۔
بہر حال ایسے کئی اشخاص سے جو یوں پریشان ہوتے ہیں پوچھ گچھ کر کے
میں ان نتیجوں پر پہنچا ہوں :

اول : معلوم ہوتا ہے کہ انسان زندگی کے اسرار سے ہمیشہ جذباتی طور پر متاثر ہوا ہے۔ اس سے ہمارے بعض دوستوں کو یہ پریشانی لاحق ہو جاتی ہے کہ مبادا سائنسی تحقیق کے نتیجے میں اسرار کا ذخیرہ ختم ہو جائے اور ہم ہمہ دان تو ہو جائیں لیکن ساتھ ہی جمالیاتی لذت سے محروم اور افسردہ ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں ویبلن کے اس قول سے تسکین حاصل ہو کہ سائنسی تحقیق کا آخری ماحصل یہ ہے کہ جہاں پہلے ایک سوال تھا وہاں دو سوال پیدا ہو جاتے ہیں اور اس کے پیش نظر کہ بنیادی اسرار مذہبی جذبات کے بھی لوازم ہیں ان لوگوں کی بھی تسلی ہو جانی چاہیئے جو سمجھتے ہیں کہ سائنس مذہب کو تباہ کر دے گی۔

ایک اور پریشانی یہ معلوم ہوتی ہے کہ جوں جوں سائنس سے واقفیت بڑھتی جاتی ہے انسان کی جمالیاتی، اخلاقی، ادبی اور فنی پرکھ کمزور ہوتی جاتی ہے۔ میں ایک نباتیات دان کو جانتا ہوں جو اپنے طالب علموں کو جنگل میں لے جاتا ہے جب سبزہ انتہائی جوبن پر ہوتا ہے اور وہاں اپنے مشاہدات پر بڑی گرم جوشی سے تقریریں کرتا ہے۔ اس کے طالب علم ان پہل قدمیوں سے بڑے محظوظ ہوتے ہیں اور یہ اقرار کرتے ہیں کہ ان کی توجہ کئی ایسی چیزوں پر دلائی جاتی ہے۔

جو انہوں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھیں۔ لیکن میں نے انہیں یہ کہتے بھی سنا ہے کہ "افسوس، ہمارا استاد یقیناً بڑا افسردہ ہوگا کیونکہ اگر کسی کو تمام پودوں کے ناموں، عادات واطوار اور ہیئت ترکیبی کا اتنا زیادہ علم ہو تو اس کی جمالیاتی حس مردہ ہو جاتی ہے۔"

اُسی ادارے میں ایک طبیعیات دان ہے جو الوان اور اصوات پر خاص سبق دیتا ہے کیونکہ اسے مصوری اور موسیقی سے عمر بھر کی دلچسپی ہے۔ ایک دفعہ اس نے ایک شام نہایت زرق برق غروب کی طبیعیاتی نوعیت پر ایک خاصا طویل برجستہ لیکچر دیا۔ کالج میں اس بیچارے سے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا گیا کیونکہ اس نے غروب کا تجزیہ تو کیا لیکن اس سے لطف اندوز نہ ہو سکا۔ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ مجھے پریشان طالب علموں نے اکثر اوقات پوچھا ہے کہ کیا انسانی روابط اور جذبات کے بے لاگ تجزیے سے ہم زندگی کی لطیف مسرتوں سے محروم نہیں ہو جائیں گے۔ اس میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہ سوال ہمیشہ دوسروں کے مخصوص شغل کے متعلق ہوتا ہے نہ کہ اپنے متعلق۔ موسیقی دان سے پوچھئے کہ کیا توافق اور تناغم کے مطالعے سے اس کی موسیقی سے لطف اندوزی میں فرق آیا ہے۔ اس کے جواب میں وہ آپ کو غالباً یقین دلائے گا کہ آپ اس مطالعے کے بغیر موسیقی سے صحیح طور پر لطف اندوز ہو ہی نہیں سکتے۔ لیکن وہ طبیعیات دان کی جمالیاتی زندگی پر تردد کا اظہار کرے گا اور نباتیات دان اور عمرانیات دان

کے متعلق تو وہ کہے گا کہ وہ توجمالیاتی تجربے کے اہل ہی نہیں۔

یہ درست ہے کہ سائنس دان بھی اور لوگوں کی طرح جن میں مزدور، تاجر، بینک کار اور شاعر شامل ہیں، بعض اوقات اپنے مخصوص شغل میں اتنے منہمک ہوجاتے ہیں کہ وہ متوازن شخصیت کی نشو و نما میں ناکام رہتے ہیں۔ لیکن یہ صرف سائنس دان ہی کا خاصّہ نہیں۔ یہ قول فن کاروں اور مذہب کے پرستاروں پر بھی اتنا ہی صادق آتا ہے۔ یہ بھی ہے کہ سائنسی تعلیم کے کڑے تقاضے اکثر اوقات، دوسری چیزوں پر توجہ کرنے کی فرصت ہی نہیں دیتے۔ لیکن فن کار بھی تو سائنس اور ریاضیات ایسے مشغلوں کے جمالیاتی اور فنی پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور اسی طرح ممتاز سائنس دانوں کی ادبی پرکھ کا اندازہ لگانے سے بھی قاصر ہوتے ہیں۔

یہ خیال کہ سائنس کا جمالیاتی پرکھ پر مضر اثر ہوتا ہے بے بنیاد ہے اور سادہ لوحی پر مبنی۔ در اصل میں سمجھتا ہوں کہ ہم ایک قدم آگے بڑھ کر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کا اعتراض غیر شعوری خود بینی ہے جس سے لوگوں کے دلوں میں یہ یقین پیدا ہوجاتا ہے کہ وہ خود، ان کی تعلیم اور ان کا نقطۂ نظر دنیا بھر کے لئے نمونہ ہیں۔ ایسے کئی لوگ ہیں جنہیں یقین ہے کہ اگر کسی نے فلاں نظم یا کلاسیکل کتاب نہیں پڑھی تو وہ زندگی کے اعلیٰ تجربات میں شریک نہیں ہوا اور اس کی شخصیت اُدھوری رہ گئی ہے۔ چنانچہ "ادبیات پرست" مختلف ناولوں سے کرداروں کی فہرستیں مرتب کرتے ہیں اور ہمیں سنجیدگی سے یقین دلاتے ہیں کہ اگر ہم ان تخیلی تخلیقوں سے واقف نہیں

تو ہم " نامکمل طور پر زندہ ہیں یہ دراصل میرے خیال کے مطابق اعلیٰ جذباتی، جمالیاتی اور اخلاقی تجربات کئی طریقوں سے حاصل ہو سکتے ہیں جیسا کم از کم ایک شاعر نے کہا ہے " خدا اپنا ظہور کئی طرح سے کرتا ہے " اب جو پُرانا دور ختم ہو رہا ہے اور سائنس کی ترقی جاری ہے تو ہمیں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے ۔

یہاں تک تو ہم نے زیر بحث مسئلے کے عمومی پہلوؤں کا ذکر کیا ہے ۔ آئیے اب اس کے چند خصوصی پہلوؤں پر غور کریں ۔

سب سے پہلے ہم یہ کہیں گے کہ یہ خطرہ کہ سائنس کی توسیع خاص کر معاشرتی میدان میں، فنون کے انحطاط کا باعث ہو گی گذشتہ تجربے کی روشنی میں بے بنیاد معلوم ہوتا ہے ۔ اس بارے میں آج تک کے حقائق کیا ہیں ؛ وہ یہ ہیں کہ جب بھی سائنس نے ترقی کی ہے تو فنون کو بھی ہر لحاظ سے فروغ ہوا ہے ۔ آج کل عوام کو موسیقی، مصوری اور ادب کی بہترین تخلیقات میسر ہیں اور وہ اس پیمانے پر کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی ۔ آبادی کا پہلے سے بہت زیادہ حصہ ان مشغلوں میں مصروف ہے اور پہلے سے بہت زیادہ حصے کے پاس اتنی فرصت اور تعلیم ہے کہ وہ ان تخلیقات سے بہرہ اندوز ہو سکتا ہے ۔ انجام کار ایسی تخلیقات کی جانچ کا معیار ہی غالباً یہ ہو گا کہ وہ کتنی دیرپا ہیں اور ان کی دل کشی کتنی وسیع ہے ۔ لیکن عمرانیات کی ترقی ، جیسے وہ اس کتاب میں تصور کی گئی ہے ، تمام فنون کی تخلیق اور استفادے میں صرف بہتری

بھی پیدا کر سکتی ہے کیونکہ گو موجودہ صورت حال ماضی کے سب ادوار سے، جن میں "زرین ادوار" بھی شامل ہیں، زیادہ سازگار ہے تاہم فنون کے ساتھ اب بھی سوتیلی اولاد کا سا سلوک ہو رہا ہے۔

معاشرتی علوم کی ترقی اسے صرف واضح ہی نہیں کرے گی بلکہ فنون کے عروج کے ذرائع مہیا کر کے انہیں زیادہ نمایاں حیثیت دلائے گی۔ سائنس بذات خود کوئی مقصود نہیں ہے بلکہ وہ ہر مقصد کے حصول کا سب سے کارگر ذریعہ ہے جو انسان نے اب تک دریافت کیا ہے۔ حصول مقاصد کی کوشش کو ہمیشہ "پسندیدہ زندگی" سے تعبیر کیا جاتا رہا ہے گو اس ترکیب کے معنی زمانے کے ساتھ بدلتے رہے ہیں بہرحال یہ امر قابلِ غور ہے کہ گو پسندیدہ زندگی کا تصور بدلتا رہا ہے اس میں فنون کو ہمیشہ بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ چنانچہ اگر انسان اپنے تمام مقاصد کے حصول کے زیادہ کارگر طریقے اختیار کرے تو فنون کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ فائدہ ہونا چاہیئے۔ الغرض فنون کو صرف سائنسی اصولوں پر مرتب کئے ہوئے معاشرے ہی میں پوری اہمیت حاصل ہو سکتی ہے۔ صرف ایسا معاشرہ ہی وہ صنایعاتی ذرائع، صحت اور فرصت مہیا کر سکتا ہے جن سے فنون کی تخلیق اور قدرشناسی پہلے سے زیادہ ممکن ہو سکتی ہے۔

تو پھر آج کل کے ادیب سائنس کی دراز دستیوں کے خلاف اتنا ہنگامہ کیوں برپا کر رہے ہیں؛ بعض زیادہ عام وجوہات یہ ہیں پہلے

ہی رائے زنی کر چکا ہوں۔ دوسرے فنون کے مقابلے میں ادب اپنے آپ کے لئے سب سے زیادہ خطرہ محسوس کر رہا ہے کیونکہ ادیب سمجھتے ہیں کہ ادب فن کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ تمام ماضی میں اور آج کل کافی حد تک ادب ایک قسم کا معاشرتی علم بھی سمجھا جاتا رہا ہے۔ آج کل لوگوں کی بڑی اکثریت عمرانیات، نفسیات، سیاسیات اور معاشیات کے وہ اصول کہاں سے اخذ کرتی ہے جو بیوپار میں اس کی رہنمائی کرتے ہیں اور انسانی امور سمجھنے میں اس کی مدد کرتے ہیں؟ اس کے چند ذریعے یقیناً ناول اور اس کا ڈرامائی مدِمقابل یعنی سینما اور اخبارات ہیں۔ جہاں تک یہ ذریعے سائنسی صداقت کی ترجمانی کرتے ہیں یہ میلان قابلِ تعریف ہے اور ادب اور دیگر فنون کے عظیم کارناموں پہ دلالت کرتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ کئی مصنفوں پہ ابھی تک روشن نہیں ہوا کہ جب ادب کے اظہارات سائنسی صداقت کے مطابق نہ ہوں تو تمام عملی توافقات میں سائنس کو مقدم رکھنا چاہیئے۔ اگر ادبی برادری اس نتیجے سے دل شکستہ ہوتی ہے تو اسے یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کا سب سے ضروری فرض سائنسی خیالات اور دریافتوں کی شرح کرنا، حمایت کرنا اور انہیں نشر کرنا ہے۔

جہاں تک طبیعی علوم سے سروکار رکھنے والے سوالوں کا تعلق ہے یہ بات عام طور پہ پائی جاتی ہے۔ لیکن مشکل یہ معلوم ہوتی ہے کہ کئی نام نہاد مصنفوں نے اس قسم کی عمرانیات کا نام ہی نہیں سنا جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ وہ نفسیات کو دماغی معالجے سے، معاشیات کو

سرمایہ داری، اشتراکیت یا کسی اور نظام فکر سے، عمرانیات کو عیسائی اشتمالیت اور معاشرتی خدمت سے لے کر ماورائی فلسفے تک ہر چیز سے خلط ملط کرتے ہیں۔ اگر کوئی عمرانیات دان کسی تفریحی ادبی محفل میں مصدقہ سائنسی حقائق کا ذکر کرے تو ادب کے پرستار مروجہ ناولوں کے کرداروں اور واقعات کا حوالہ دے کر اسے غلط ثابت کرنے میں اپنے آپ کو حق بجانب جانتے ہیں۔ اگر اس پر یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ تو خیالی باتیں ہیں تو جھٹ اور ناولوں کے حوالے دیئے جاتے ہیں اور دلیل کی قطعیت ثابت کرنے کے لئے غالباً سینما کی کسی فلم اور اخبار کے کسی مضمون کے حوالے بھی شامل کر لئے جاتے ہیں۔

جب تک عمرانیات دانوں کے اپنے ذہنوں میں یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ موجودہ زمانے میں معروضی حقیقت کی حکم سائنس ہے یا فن تو ہم فنکاروں کو اس خلط مبحث کا الزام کیسے دے سکتے ہیں؟ مثلاً کیمبرج یونیورسٹی کے ایک معلم عمرانیات نے نیویارک ٹائمز میگزین میں "امریکی کا یورپی تصور" پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا:

"سینما کی فلمیں فارغ البالی اور تغیر پذیر معاشرتی نظام کا پتا دیتی ہیں۔ ممکن ہے یہ تاثر غلط ہو لیکن یہ قابل اعتنا ضرور ہے۔ میں نے اتنے زیادہ زوردار امریکی ناول پڑھے ہیں کہ میں اس دعوے سے اتفاق نہیں کر سکتا کہ امریکا میں عام آدمی کی زندگی بحیثیت مجموعی یورپ کے کسی صنعتی ملک کی زندگی سے زیادہ آسودہ ہے۔ لیکن اگر میں نے یہ ناول نہ پڑھے

ہوتے تو میں اس دعوے سے اتفاق کر لیتا۔ بیشتر اہلِ یورپ امریکا کے متعلق وہی کچھ جانتے اور سمجھتے ہیں جو وہ فلموں میں دیکھتے ہیں۔"

یعنی جہاں بیشتر اہلِ یورپ امریکا کے متعلق اپنے خیالات فلموں سے لیتے ہیں یہ "عمرانیات داں" ایسا سادہ لوح نہیں ہے۔ وہ فلموں کے اعتبار کی تصدیق ناولوں سے کرتا ہے۔ یعنی اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کسی خرگوش کے بل کی تہ پر صورتِ حال کیا ہے تو لوئس کیرل کی ایک تصنیف پڑھئے جس میں ایک ایک عینی گواہ بنام ایلس کا بیان درج ہے۔ یا اگر آپ برطانوی ناولوں میں بیان کردہ برطانوی زندگی کے اعتبار کی تصدیق کرنا چاہتے ہیں تو برطانوی فلمیں دیکھئے۔

آج کل اس پر بڑی لے دے ہو رہی ہے کہ ہمارے تعلیمی نظام میں سائنس، ادب اور انسیات کی اضافی اہمیت کیا ہے اور ان میں سے کون معاشرتی عمل میں رہنما ہونا چاہیئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس خلط مبحث اور نزاع کا سرچشمہ مذکورہ بالا موقف ہے۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ عمرانیات اپنے آپ کو ابھی تک اتنا قابلِ یقین نہیں بنا سکی کہ وہ بیشتر ادیبوں، فلسفیوں، مبلغوں اور عوام کے لئے قابلِ قبول ہو سکے اور وہ عمرانیات دانوں کے نتائج کو فن کاروں کے تاثرات کی نسبت حقیقت کی زیادہ قابلِ اعتبار تشریح سمجھ سکیں۔ عمرانیات دانوں کے کئی مقالے اتنے غیر تسلی بخش بلکہ مضحکہ خیز ہوتے ہیں کہ فن کار اور عوام اس رویے میں کسی حد تک حق بجانب ہیں۔ چونکہ ناقص عمرانیاتی

مقالوں کو مستند مقالوں کی نسبت زیادہ وسیع اشاعت ملنے کا امکان ہوتا ہے اس رویے کی اور بھی تقویت ہوتی ہے ۔چنانچہ جب النسیات پرست عمرانی تحقیق کی چھان بین کرتے ہیں تاکہ وہ دیکھیں کہ اس میں ٹامس ایکویناس کے مقابلے میں کتنی صداقت ہے تو وہ ایسے عمرانیاتی مقالے انتخاب کرتے ہیں جن میں رخنے نکالے جا سکتے ہیں ۔ یہ ادیبوں کا ایک مقبول طریقہ ہے اور ہونا بھی چاہیئے کیونکہ ان میں اکثر اعلیٰ قسم کے عمرانیاتی مقالے پڑھ ہی نہیں سکتے ۔ اندریں حالات انہیں ان کے غلط نتائج کے لئے مورد الزام ٹھہرانا درست نہیں ۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ اگر عمرانیات موجود نہ ہو تو ہر قسم کی ادبی اور فنی تخلیقات سے بلاشبہ ایسے اشارے اور قیاسات مل سکتے ہیں جو کم و بیش صحیح ہوں ۔ میں مانتا ہوں کہ ضرب الامثال تعمیم کی قدیم ترین کوششیں ہیں، ایسی ہی جیسے سائنس کی ۔ یہ بھی غالباً درست ہے کہ جیسے سائنس داں ہمیں بتاتے ہیں، انجیل بھی اپنے زمانے کی سائنس کی نمائندگی کرتی ہے دراصل فن کار اور النسیات پرست کے پاس ایک ترمپ کا پتا یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی صدیوں پہلے لکھی ہوئی نظم، ناول یا فلسفیانہ تصنیف سے کوئی اصول پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دیکھو سائنس، لباریٹری میں بڑی کٹھن تحقیق کے بعد، بالآخر اب اس کی تصدیق کر سکی ہے ۔ لیکن جو بات نظر انداز کر دی جاتی ہے یہ ہے کہ انہی ادبی تصانیف میں سینکڑوں اور تعمیمیں ہوتی ہیں جن کی ہرگز کوئی سائنسی بنیاد نہیں ہوتی ۔ مشکل یہ ہے

کہ جو ہمیں جاننا چاہیئے اور جو ہم سائنسی پرکھ کے بغیر نہیں جان سکتے یہ ہے کہ فن کار کی متعدد وجدانی اٹکلوں میں کون سی قابلِ اعتبار ہیں۔ یونانی فلسفیوں کی عظمت واحترام کی بڑی وجہ یہی ہے۔ یعنی لوگ فلسفیوں کی صحیح اٹکلوں کو تو یاد رکھتے ہیں لیکن وہ فاش غلطیاں جو ان سے سرزد ہوئیں بھول جاتے ہیں۔

لہٰذا یہ واضح ہو جانا چاہیئے کہ ادب اور دوسرے فنون عمرانیات کا بدل نہیں ہو سکتے۔ تاہم وہ دو نہایت اہم طریقوں سے سائنس کے لئے بے حد مفید ہو سکتے ہیں۔ (۱) فنون، بالخصوص ادب، سائنسی مفروضوں کے مآخذ کا کام دے سکتے ہیں۔ (۲) فنون سائنسی حقائق کے ابلاغ اور انہیں ڈرامائی انداز سے پیش کرنے میں انمول ثابت ہو سکتے ہیں۔ تیز جذباتی ترغیب کے ذریعے لوگوں کو صحیح سائنسی اصولوں کے مطابق عمل کرنے پر آمادہ کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس جب فن کے اظہارات سائنسی صداقت کے مطابق نہ ہوں تو وہ مضرت رساں ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں۔ وہ قوموں کو ایک دوسری کے خلاف صف آرا کر سکتے ہیں اور لاتعداد افراد کو ایسی بے کار اور تباہ کن جستجوؤں میں الجھا سکتے ہیں جن کا نتیجہ سوائے محرومی اور مایوسی کے کچھ نہ ہو۔ جنگ کے بد نتائج میں یہ بھی شامل ہے کہ فنون کو دروغ کی حمایت میں استعمال کیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ ظاہر ہے کہ انسان کی جذباتی اور تخیلی نشو و نما میں اور انسانی تجربے کی توسیع میں بھی، جس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا،

فنون کی اپنی اہمیت ہے۔ یہاں مجھے صرف اس سے سروکار ہے کہ فنون نے سائنس میں، جو طبیعی اور معاشرتی امور میں حکم ہے، کوئی اضافے کیئے ہیں یا نہیں۔

چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ سائنس اور فنون کی مفروضہ آویزش قطعاً بے بنیاد ہے اور ان کے وظائف کے غلط تصور کا نتیجہ ہے۔ میں اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوں کہ میں نے اس محدود گنجائش میں ان وظائف کا تفصیلی بیان درج کر دیا ہے۔ ان وظائف کو ادر میدانوں میں کام کرنے والوں نے پوری تفصیل سے اور تسلی بخش طور پر قلم بند کیا ہے۔ میں نے صرف ان کے باہمی تعلق کی طرف اشارہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اس عام اصول کی طرف جس کی روشنی میں ان کے اپنے اپنے وظائف معین کیے جا سکتے ہیں۔

۳۔ سائنس اور مذہب

جب ہم مذہب اور سائنسی دنیا میں اس کی حیثیت کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہمیں شروع ہی میں ایک مشکل کا سامنا ہو جاتا ہے۔ یہ مشکل ہر اس چیز پر بحث کرنے میں مضمر ہوتی ہے جس کی صحیح تعریف نہ ہوئی ہو۔ اور ظاہر ہے کہ بحث کا سارا دارومدار اس تعریف پر ہی ہو گا۔ مثلاً اگر ہم آئن سٹائن کا یہ قول مان لیں کہ خود سائنس مخلص سائنس دان کا مذہب ہو سکتی ہے تو ظاہر ہے کہ سائنسی دنیا میں مذہب کی حیثیت پر کسی بحث کی گنجائش نہیں رہتی۔ ممتاز پادری بھی تقریباً اسی رائے کا اظہار

کرتے ہیں جب وہ کہتے ہیں کہ کسی بھی نصب العین کے حصول کی مخلصانہ کوشش مذہب ہے۔ چنانچہ ہیری ایمرسن فاسڈک نے منبر سے کہا تھا کہ نازیت بھی مذہب تھا گو بُرا۔ میرے خیال میں پروفیسر ایچ، آر، مسّی نے حتمی طور پر ثابت کر دیا تھا کہ روسی اشتمالیت، کم از کم اپنی عمر کی پہلی دہائی میں، مذہب کے تمام تقاضوں کو پورا کرتی تھی۔ مذہبی بیوہار کی اہم ترین خصوصیات کے متعلق جو بہترین انسانیاتی تحریریں میری نظر سے گزری ہیں وہ ڈور کہائم اور آنجہانی اڈورڈ سابیر کی ہیں۔ اگر ان خصوصیات کا تجزیہ کیا جائے تو مذہب کی مذکورہ بالا تعریف صحیح ثابت ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو ظاہر ہے کہ سائنس بمقابل مذہب کوئی مسئلہ ہی نہیں، خاص کر جب بعض مذاہب اپنے مقاصد کے حصول میں سائنسی تہا جوں پر پورا تکیہ کرنا چاہتے ہیں۔

لیکن ایسے لوگ بھی ہیں جو مذہب کی مذکورہ بالا تعریف پر اعتراض کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ گو اس کی صحت کی دلیلیں پیش کی جا سکتی ہیں وہ عام دلچسپی کے متنازع فیہ مسئلے کو نظر انداز کر جاتی ہے۔ یعنی سائنسی دنیا میں اُن کے اپنے مذہب کی حیثیت کیا ہو گی؟ الغرض جب لوگ سائنس اور مذہب کے موضوع پر گفتگو کرتے ہیں تو ان کی توقع ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی صورت میں یہ بات زیر بحث آئے گی: اگر معاشرتی علوم اُس طرح ترقی کریں جیسے ہم نے گذشتہ ابواب میں بیان کیا ہے تو اس کا اثر اُس نظام عقاید و اعمال پر کیا ہو گا جو مثلاً ۱۹۶۰ میں ریاست ہائے

متحدہ امریکا کے عیسائی مذہب کا ہے؟ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا کی نصف سے کم آبادی عیسائی مذہب کی پیرو ہے اور باقی ماندہ آبادی میں کروڑوں اشخاص کے ایسے مذہبی عقاید ہیں کہ ان میں خدا ہے نہ فوق الفطرت ہستیاں تو مذکورہ بالا موقف کے یہ معنی ہوئے کہ ہماری بحث سائنس اور مذہب کے عام موضوع سے ہٹ کر اس کے کسی خاص پہلو پر ہونی چاہیئے۔ مگر چونکہ افراد کا تعلق موضوع کے اسی مخصوص پہلو سے ہے اس لئے متنازع فیہ مسئلے کو محض عام باتیں کہہ کر ٹالنا نہیں چاہیئے۔

تو جو سوال لوگوں کے ذہنوں میں سب سے پہلے اٹھتا ہے یہ ہے: سائنسی دنیا میں خدا اور اختیار کا مقام کیا ہوگا؟ خوش قسمتی سے ہم اس کا سائنسی نقطۂ نظر سے تسلی بخش جواب دے سکتے ہیں بغیر اس کے کہ ہم اُن مابعد الطبیعیاتی پیچیدگیوں میں اُلجھیں جو اس موضوع کو دھندلا دیتی ہیں اور وہ یہ ہے کہ جہاں تک اُن عملی مقاصد کا سوال ہے جن کا میری بیان کردہ سائنسی دنیا سے تعلق ہے آپ خدا اور اختیار پر جو بھی عقیدہ رکھنا چاہیں رکھ سکتے ہیں۔ سائنسی مقاصد کے پیش نظر مجھے صرف یہی کہنے اور ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ عوام ایسی باقاعدگی سے عمل کرتے ہیں کہ وہ قابل پیش گوئی ہے۔ میں لوگوں کے عمل کی ٹھیک انہی طریقوں سے پیش گوئی کر سکتا ہوں جو میں مظاہر فطرت کی پیش گوئی میں استعمال کرتا ہوں۔ یہی بات خدا کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ وہ واضح طور پر ایسی ہستی ہے جس کی عادات حیرت انگیز طور پر باقاعدہ ہیں۔ خدا

اور انسان کے اعمال کی یہی باقاعدگی ہے جس سے سائنس کو دلچسپی ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ وہ گوناگوں مابعدالطبیعیاتی سوالات جن پر سائنس دانوں اور عالمانِ دین میں اختلاف ہے کسی اور پہلو سے اہم نہیں ہو سکتے۔ نہ ہی میں یہ جاننے کا دعوے کر رہا ہوں کہ مستقبل میں سائنسی یا غیر سائنسی حالات کے تحت عقاید میں کیا تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ معاشرتی بیوہار کی باقاعدگی کا مطالعہ اور اس کی پیش گوئی اور ان کوائف کی بنا پر کلیات مرتب کرنے کا کام جاری رہنا چاہیئے بغیر اس کے کہ ہم علت غائی کے مابعدالطبیعیاتی مسئلے، جن سے سائنس کو سروکار نہیں، طے کریں۔ اسی وجہ سے سائنس دانوں کو اسی دنیا سے سروکار رکھنا چاہیئے جو ان کی دسترس میں ہے اور انھیں کسی ایسے سوالات میں نہیں اُلجھنا چاہیئے جو کسی اور دنیاؤں کے متعلق ہوں، اگر ایسی دنیائیں ہیں بھی۔ میرے خیال میں عمرانیات دانوں کو یہ بات زیادہ کوشش سے واضح کرنی چاہیئے تاکہ عوام کا وہ حصہ ان کے ساتھ زیادہ گرم جوشی سے تعاون کر سکے جو مختلف مابعدالطبیعیاتی موقفوں کو ترجیح دیتا ہے۔

اس کی کوئی وجہ نہیں کہ سب لوگ اس پر کیوں نہ متفق ہو جائیں، جیسے وہ طبعی علوم کے بارے میں ہیں، کہ ہر قسم کے بیوہار کی باقاعدگیاں اور امکانات کے بیان کرنے میں سائنسی منہاجوں کی صحت مسلم الثبوت

ہے۔ جیسے میں اگلے باب میں بحث کروں گا ہم مابعد الطبیعیاتی سوالات کو فرد کے ذوق، مزاج اور ضروریات کے لئے کیوں نہ چھوڑ دیں ؟ خود سائنس دانوں کے درمیان روشنی کے جسیمی اور موجی نظریوں کی نسبتی خوبیوں پر بحثیں ہوتی رہی ہیں اور اب اس پر ہوتی ہیں کہ برقیوں کے رقص کا محرک کیا ہے بعض نقطہائے نظر سے یہ سوالات بڑے اہم ہیں لیکن ان کا نہ ان منظاہر کے مسلمہ کلیات پر اثر پڑتا ہے نہ انجینئری کے عملی کاموں پر۔

سائنس اور مذہب کی بحث کے بارے میں اس نقطہ نظر پر جتنا بھی زور دیا جائے کم ہے۔ سائنس وہ بے حد طاقتور آلہ ہے جو انسان نے اپنی ہر قسم کی حاجات پورا کرنے کے لئے ایجاد کیا ہے۔ اگر ہم یہ لغو عقیدہ رکھیں کہ ہم اس سے مدد نہیں لے سکتے جب تک کہ ہم پہلے بیشتر غیر متعلق مابعد الطبیعیاتی سوالات طے نہ کریں تو خطرہ ہے کہ ہم اس آلے کی برکات سے محروم ہو جائیں گے۔ یہ اور بھی لغو ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہم طبیعی علوم میں اس کا تصفیہ کر بھی چکے ہیں۔ کلیسا کے زیر انتظام اداروں میں بنیادی طور پر وہی طبیعیات، کیمیا اور حیاتیات پڑھائی جاتی ہے جو حکومت کے زیر اہتمام اداروں میں۔ یہ علوم عیسائی اور غیر عیسائی ملکوں میں یکساں ہیں۔ اگر طبیعی علوم کی ترقی اور اطلاق کا دارومدار اس پر ہوتا کہ پہلے عام لوگوں کے تمام مابعد الطبیعیاتی سوالوں اور ثقافتی رجحانوں کا تصفیہ ہر ایک کی مرضی کے مطابق ہوئے تو

پنسلین، برق، ہوابازی اور ریڈیو کو کبھی قبول عام حاصل نہ ہوتا۔ طبیعیات کی بے مثال اور انمول خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ انتہائی مختلف نسلوں، ثقافتوں اور مذاہب کی عقیدت اور وفاداری حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ سائنس کی یہ خصوصیت اس کی عام صداقت اور موزونیت عمرانیات اور طبیعیات والوں کو تمام لوگوں کی حمایت کا مستحق بنا دیتی ہے گو لوگوں میں دوسرے کتنے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں۔ اس پر نہ صرف اہل کلیسا ہی کو غور کرنا چاہیئے بلکہ ان سائنس والوں کو بھی جو غلطی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ سائنس صرف انہی کی اپنی ثقافت، انہی کے اپنے بے حقیقت سیاسی، معاشی اور مذہبی عقیدوں اور انہی کی اپنی طرز حکومت کے ماتحت پنپ سکتی اور کارآمد ہو سکتی ہے۔

جہاں تک مذاہب کے اخلاق، جمالیاتی اور تفریحی پہلوؤں کا تعلق ہے۔ یہاں بھی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ وہ ایک ایسی دنیا میں جہاں عمرانیات اور طبیعیات برسر اقتدار ہوں کیوں نہ پہلے سے بھی زیادہ آزادی سے جاری رہ سکیں۔ اخلاقی معیار بدلتے رہیں گے جیسے وہ بدلتے رہے ہیں اور انسانی ادارے، کلیسا سمیت، اپنے آپ کو ان تبدیلیوں کے مطابق ڈھالتے رہیں گے جیسے وہ ڈھالتے رہے ہیں۔ اس توافق میں ترقی یافتہ عمرانیات سے بڑی مدد ملے گی کیونکہ انسان سائنس کے ذریعے مختلف قسم کے اعمال کے نتائج کا زیادہ صحیح علم حاصل کر سکتا ہے بجائے اس کے کہ وہ دقیانوسی اور جلے اصول

پند و نصائح پر تکیہ کرے۔ یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ سائنس کے تحت منظم کردہ معاشرے میں مذہب کے جمالیاتی اور تفریحی پہلو اور بھی ترقی کریں گے۔

میں تفریح کا لفظ اس کے لغوی معنوں میں استعمال کر رہا ہوں۔ میں اس سے انسان کے ان مشغلوں کی تخصیص کر رہا ہوں جن سے اُسے براہِ راست تسکین حاصل ہوتی ہے اور جو حصول مقاصد کے ذرائع نہیں ہوتے۔ یہ ایسے مشغلے ہیں جن سے انسان کو سکون، آرام، روحانی تازگی کی توقع ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ مذاہب کی رسوم، ارکان اور عبادات کی دل کشی کی وجہ یہی بنیادی حاجت ہے نہ کہ وہ تکوینیات، مابعد الطبیعیات اور اخلاقیات جو بعض مذاہب کا جزو ہیں۔ تفریح کی آرزو انسان میں اتنی ہی قدیم اور بنیادی ہے جتنی اس کی دوسری بنیادی حاجتیں اور اسی وجہ سے مذہبی تہوار سائنسی دنیا میں بھی اپنا مقام برقرار رکھ سکے گا۔ اس نقطہ نظر سے مذہب اور ادب اور دیگر فنون کی یکساں حیثیت ہے کیونکہ ان کی پوری اور مناسب نشوونما صرف ایسے معاشرے ہی میں ہو سکتی ہے۔ معاصر معاشرے میں موزوں تفریح کی طرف سے بے توجہی جس کا نتیجہ غالباً اعصابی اور دماغی امراض اور مجرمانہ افعال ہو رہا ہے اس کا سب سے زیادہ شرمناک پہلو ہے، خاص کر جب کہ اس کے پاس مناسب صناعیات اور ذرائع ہیں جنھیں سائنسی طور پر استعمال میں لا کر انسان کی فنون اور مذہبی رسوم کے ذریعے روحانی

تسکین اور نشو و نما ہو سکتی ہے۔

انسان کی روحانی نشو و نما سے میری مراد کوئی پراسرار چیز نہیں۔میری مراد یہ ہے کہ ہر ممکن ذریعے سے انسان کی تعبیری بیوہار کی صلاحیت کی معرفت اس کی مراسلت، تخیل اور ہمدردی کی قوتوں کی نشو و نما کی جائے۔ انسان کی روحانی زندگی عبارت ہے اس کے ایسے خیالات سے جو بالعموم الفاظ اور دوسرے تعبیری تصورات کی صورت میں ہوتے ہیں۔ "اغراض" اور "مقاصد" ایسے الفاظ سے ہماری مراد وہ لفظی تصورات ہیں جو انسان اپنی خواہشوں اور آرزوؤں کی بنا پر حاضرات کرتا ہے۔ یہ لفظی تصورات جب قلم بند ہو جاتے ہیں تو وہ ویسے ہی معروضی مظاہر بن جاتے ہیں جیسے ہماری دیواروں پر لٹکی ہوئی تصویریں۔ ہم ان عملوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں جن سے انسان انہیں اختراع کرتا ہے اور ہم لوگوں اور خود ان کے مخترع پر ان کے اثر کا مطالعہ بھی کر سکتے ہیں جیسے ہم کسی دوسرے ماحول کا مطالعہ کرتے ہیں۔

"ذہنی" اور "روحانی" زندگی کو انسان کے تعبیری بیوہار (اس کے خیالات، خواب، تخیل، آرزوئیں، عبادت وغیرہ) کی روشنی میں دیکھنے سے اس کے ارفع و اعلیٰ رتبے کا استخفاف نہیں ہوتا۔ کیا یہ غیر معمول بات نہیں کہ ارتقا کی ان گنت صدیاں بالآخر ایسی ہستیوں کو معرض وجود میں لائیں جو کلام اور فنی اظہار کی معرفت ایک دوسری سے اور خیالی مخلوق سے تبادلۂ خیالات اور احساسات کر سکتی نہیں؟ جن بلندیوں

تک انسانی ذہن (نفس، روح) پرواز کرسکتا ہے وہ مرعوب کن ہیں۔ چنانچہ یہ تعجب انگیز بات نہیں کہ انسان نے اس قوت کی تشریح ماورائے فطرت تلاش کی۔ لیکن نفس انسانی اپنی وقعت میں کچھ گھٹ تو نہیں جاتا اگر اسے مینار فطرت کا کلس سمجھیں۔

ماضی میں انسان کے تعبیری بیوہار کو ذہن، نفس، روح ایسے نام دئیے جاتے رہے ہیں۔ جن مظاہر کی طرف یہ الفاظ اشارہ کرتے ہیں ان کی مختلف زمانوں میں مختلف تشریح ہوتی رہی ہے۔ سائنس اپنی ترقی کے دوران میں ان الفاظ کو ترک کر سکتی ہے اور ان مظاہر کی تشریحیں تبدیل کر سکتی ہے لیکن وہ ان مظاہر کو نظرانداز نہیں کر سکتی اور نہ ہی کرنا چاہتی ہے۔ یہ ان معنوں میں اور اس وجہ سے ہے کہ مذہب اور روحانی واردات سائنسی تحقیق کے لئے اتنے ہی موزوں موضوع ہیں جتنے انسانی بیوہار کے اور پہلو۔

۴۔ سائنس اور اخلاقیات

سائنس ہمارے ہر قسم کے مقاصد کے حصول کا سب سے کارگر آلہ ہے۔ چنانچہ گو لوگوں کے درمیان علت غائی اور انسان کے آغاز یا انجام پر کتنا ہی اختلاف ہو سائنس کا سبھی کو خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ الغرض ہم صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ حق دار کو اس کا حق دیا جائے یعنی سائنس کو سائنس کے موضوعات سپرد کیجئے اور مابعد الطبیعیات کو مابعد الطبیعیات کے۔

اس کتاب میں یا اس کے متصورہ معاشرتی نظام میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کی تائید ہر مذہب کے پیرو اور ہر سیاسی اور معاشی فرقے کے ارکان نہ کر سکتے ہوں بشرطیکہ وہ اپنے مقاصد کو زیادہ سے زیادہ کفایت اور حسن کارکردگی سے حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ لیکن یہی بات تنگ نظر اور خود پسند اشخاص کو برہم کرتی ہے۔ وہ سائنس کو اپنے ہی محدود مسلکوں کی تقویت کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ میرے موقف کے نکتہ چین اس پر خاص خشم گین ہوتے ہیں کہ میں خود عوام سے ان کی احتیاجات پوچھنا چاہتا ہوں اور سائنس کے سپرد یہ معمولی سا کام کرنا چاہتا ہوں کہ وہ انہیں انہی احتیاجات کے حصول کے طریقے بتائے اور ان کے معارف اور عواقب سے مطلع کرے۔ ایسے نکتہ چین، اور وہ بھی جو اس شبہے میں ہیں کہ آیا میرا موقف جمہوری ہے یا نہیں یقین رکھتے ہیں کہ سائنس کو چاہیئے کہ وہ بنی نوع انسان کو ان کی احتیاجات کا احساس دلائے۔ اس کے نتیجے میں وہ ایک اہم سوال کے متعلق مایوس کن تناقضوں، تاویلوں اور حیلہ سازیوں میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ یعنی کیا سائنس ہمیں بتا سکتی ہے کہ ہمارے مقاصد کیا ہونے چاہئیں اور ہماری احتیاجات کیا ہونی چاہیئے؟

ہم دوسرے باب میں اس سوال کے بعض پہلوؤں پر سرسری اظہار خیال کر چکے ہیں اور اب اس بحث کو مکمل کر سکتے ہیں۔ تو سب سے پہلے یاد رکھنا چاہیئے کہ افراد نے ماضی میں جن مقاصد کے حصول

کی کوشش کی ہے وہ اب تاریخی حقائق ہیں۔ اس سوال پر کچھ کہنا کہ کون سے
مقاصد انسان کے پیشِ نظر ہونے چاہئیں ذاتی رائے اور ذوق کا
معاملہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن خود آرا اور مختلف ذوق بھی تو حقائق ہیں۔ اگر
سائنس کی روشنی میں دیکھا جائے تو ذوق اور وہ انتخاب جس سے اس
کی شہادت ملتی ہے ہماری نوع کے ہزاروں صدیوں کے ارتقائی تجربے
کا نتیجہ ہے، مع ہماری اپنی پشت اور ہمارے اپنے ماحول کی شرط سازیوں
کے۔ مقاصد اور اقدار پر جتنی خیال آرائیاں ہوتی ہیں ان کے متعلق یہ دلچسپ
بات ہے کہ ان کی اہم ترین کیفیت پر شاذ ہی زور دیا جاتا ہے۔ یعنی یہ
کہ سعی انسانی کے بنیادی مقاصد پر نسل انسانی کا غیر معمولی اتفاق رائے
ہے۔ درحقیقت ہماری مشترکہ انسانیت ہی بیشتر عام مقاصد کا
تعیّن کرتی ہے۔

بعض ایسے بنیادی مقاصد کون سے ہیں جن پر تقریباً کامل اتفاق
ہے؟ اس پر ہمیشہ پورا اتفاق رہا ہے کہ فرد اور جماعت کے لئے
طبعی بقا، سلامتی اور وجہ معاش پسندیدہ مقاصد ہیں۔ تمام ماضی میں بھی
اس پر غیر معمولی اتفاق رہا ہے۔ میں نے تفریح کی سرگرمیوں میں فنی،
روحانی اور مذہبی تجربے بھی شامل کئے ہیں۔ اس پر بھی ہمیشہ تقریباً کامل
اتفاق رہا ہے کہ ایسی سرگرمیاں بذاتِ خود بیش قیمت مقاصد ہیں۔
واضح رہے کہ میں یہاں یہ نہیں کہہ رہا کہ میرے خیال میں انسان کے
یہ مقاصد ہونے چاہئیں بلکہ میں ان مقاصد کا ذکر کر رہا ہوں جو تمام

گذشتہ زمانوں میں فی الواقع انسان کے پیشِ نظر رہے ہیں۔ بحیثیت مجموعی اس نے ان مقاصد کو اس لئے پیشِ نظر رکھا کہ وہ ایسی ہستی ہے جسے ایسی تسلیوں کی اشد ضرورت ہے اور جنھیں وہ کارآمد سمجھتا ہے۔ ان دریں حالات کسی سائنس دان، مبلغ یا شاعر کا یہ کہنا کہ انسان کو کوئی اور مقاصد رکھنے چاہئیں اس کے مترادف ہے کہ انسان کو اس ہستی سے جو وہ ہے مختلف ہونا چاہیئے اور اس کی تاریخِ ارتقا اس کی فی الواقع تاریخ ارتقا سے مختلف ہوتی چاہیئے تھی۔ ایسی بات مبلغ اور شاعر تو کہہ سکتے ہیں لیکن سائنس دان نہیں۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر جماعت میں ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جو اپنی ثقافت کے مقاصد سے بھی اتفاق نہیں رکھتے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اُن عام طور پر متفقہ مقاصد سے بھی اتفاق نہ کرتے ہیں جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ یعنی ان کا عقیدہ یہ ہو کہ یہ دنیا دارالاحزان ہے، تفریح گناہ اور فریب ہے اور نروان یا بہشت ہی موزوں منزل مقصود ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مزاج اور ذوق یا شرط سازی کا سوال ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ دنیاوی مشاغل میں مصروف ہونا اُخروی مقاصد سے غفلت برتنا ہے۔ یہ امر واقعہ کا سوال ہے۔ جہاں تک وہ جماعت کے معیاروں سے متصادم نہیں ہوتے افراد اور گروہوں کو اپنا اپنا ذوق رکھنے کی اجازت ہو سکتی ہے۔ ایک نام نہاد آزاد معاشرہ مختلف ذوق کے افراد کو عام طور پر اس کی اجازت بھی دیتا ہے کہ وہ ایک دوسرے

کہ اپنے اپنے عقاید کا قائل کریں مگر اس کے ساتھ اس پر اصرار بھی کرتا ہے کہ وہ اس کے اختیار کردہ عام معیاروں سے موافقت کریں۔ لیکن امر واقعہ کے سوالات براہ راست سائنس کے حلقۂ اختیار میں آجاتے ہیں اور جیسا ہم آگے چل کر دیکھیں گے ذوق اور اخلاقیات کے بیشتر سوال بھی لوگوں کے تصور حقیقت ہی سے طے ہوتے ہیں۔

اسی ضمن میں ہم پر اقدار، اخلاقیات اور مقاصد سے سائنس کا حقیقی تعلق منکشف ہوتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جیسا انسان کے بیوہار سے ظاہر ہے زندگی کے بنیادی مقاصد پر لوگوں کی بڑی اکثریت کا عام اتفاق ہے۔ انسان زندہ رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ہم جنسوں کی صحبت سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ وہ ان سے اور اپنی دنیا اور اپنی خیالی تخلیقوں سے ربط رکھنا چاہتا ہے۔ یہ صرف طریقہ ہائے کار، مصارف اور عواقب کا سوال ہے جس پر شدید اختلاف رائے پیدا ہوتا ہے۔ یہاں صرف سائنس ہی معتبر منہاج ہے۔ ہم دوسرے باب میں دیکھ چکے ہیں کہ جن میدانوں میں سائنس آزمائی گئی ہے ان میں جو کچھ اس نے کیا ہے اور جو کچھ وہ انسانی معاشرے کے بارے میں کر سکتی ہے یہ ہے کہ وہ معتبر طور پر ہمیں بتا سکتی ہے کہ (۱) ممکن متبادل طریقہ ہائے کار کون سے ہیں اور (۲) ہر طریق کار کے مصارف اور عواقب کیا ہوں گے۔ ان حالات میں لوگ جو کچھ بھی کریں وہ ان کی اقدار ہوں گی۔ چنانچہ عام خیال کے برعکس اقدار معاشرتی علوم کے لئے کوئی خاص سدِّ راہ

نہیں ہیں۔انسانی اور تمت انسانی سب قسم کا بیوپار اقداری گردانا جاسکتا ہے اور وہ اتنا ہی باقاعدہ اور قابل پیش گوئی ہے جتنا کہ غیر ذی روح دنیا کا بیوپار۔

جب کسی جماعت کے سامنے متبادل طریقہ ہائے کار پیش کر بھی دئے جائیں اور ہر ایک کے مصارف اور عواقب بھی بتادئے جائیں تو اختلاف آرا جب بھی رہے گا کیونکہ خاص طریقہ ہائے کار کے اختیار کرانے کے متعلق مختلف ذوق اور مزاج بروئے کار آئیں گے۔اس کا فیصلہ ہمیشہ کی طرح کثرت رائے معلوم کرنے کے ان طریقوں سے کیا جائے گا جو عام طور پر متفق علیہ ہوں یا کم از کم مروج ہوں۔ یہ طریقے کئی طرح کے ہوتے ہیں یعنی جمہوریت سے لے کر اشرافیہ اور اقتدار کی مختلف قسموں اور تام تہا دمطلق آمریت تک جو میں نے نام نہاد مطلق آمریت کہا ہے کیونکہ انجام کار آمر بھی اپنی رعایا کے اخلاقی معیاروں کی مخالفت نہیں کرسکتا۔ جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے میں کثرت رائے معلوم کرنے کے لئے جمہوری طریقے کو ترجیح دیتا ہوں۔ چنانچہ جیسا میں نے ایک گذشتہ باب میں کہا تھا میں رائے عامہ اور میلان عامہ جانچنے کے ان آلوں کی نشوونما پر خوش ہوں جن کے مناسب استعمال سے نسبتاً خالص جمہوریت کی قوت بحال ہو جائے۔حقیقت یہ ہے کہ کارکردگی کے فرسودہ طریقے استعمال کر کے جمہوریت کافی رسوا ہو چکی ہے۔اگر آئندہ پشتیں اشتراک حاصل کرنے کے بہتر طریقے اختراع کرلیں تو میں ہرگز

اصرار نہیں کروں گا کہ وہ ان طریقوں کی اندھا دھند پیروی کرتے رہیں جن کا میں عادی ہوں۔

یہ سوال جس پر ہم بحث کر رہے ہیں دھواں دھار تقریروں اور مرصع تحریروں کا موضوع رہا ہے لیکن ہم نے اس کا عامیانہ سا جواب تجویز کر دیا ہے۔ اس پر قاری کو مایوسی ہوگی اور شاید یہ اسے ناگوار بھی گزرے۔ ان بھاری بھر کم دماغوں اور ان سے بھاری بھر کم کتابوں کا پورا احترام کرتے ہوئے بھی جنہوں نے اس مسئلے سے طاقت آزمائی کی ہے میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ ان کی دانشمندی کا نچوڑ اس عبارت میں ہے جس کا حوالہ عام طور پر اس ضمن میں نہیں دیا جاتا۔

"ایلس نے کہا: پیاری بلی، مجھے بتا کہ میں اب کس راستے سے جاؤں۔ بلی نے کہا: لیکن مجھے پہلے بتاؤ کہ تم کہاں جانا چاہتی ہو۔"

کیا سائنس انسان کو بتا سکتی ہے کہ اُسے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیئے؟ یقیناً، اگر انسان سائنس کو بتا دے کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے۔ کیا انسان کو وہ کرنا چاہیئے جو وہ کرنا چاہتا ہے؟ یقیناً، کیونکہ انسان کے ہزاروں سالہ اجتماعی تجربے سے حاصل شدہ حکمت سے بہتر اور کوئی رہنما نہیں ہو سکتا، خاص کر جب سائنس دان ممکن طریقہ ہائے کار کے مصارف اور عواقب کی پیش گوئی بھی کر دیں۔ اندریں

حالات یہ کہنا کہ انسان کی احتیاج اس سے مختلف ہوتی ہے جو فی الواقع ہے محض ایک معنویاتی حیلہ ہے جس سے کہنے والا ایسے " اخلاقی اصولوں " کا واسطہ دینا چاہتا ہے جو کسی ماورائے طبیعی ماخذ سے لئے گئے ہیں۔ بعض لوگ یہ دعوے کرتے ہیں کہ اگر یونیورسٹیاں انسان کو یہ نہ بتائیں کہ اس کی احتیاج کیا ہونی چاہیئے تو وہ اپنی ذمہ داری سے پہلو تہی کر رہی ہیں۔ ان کا بھی یہی جواب ہے۔ جو لوگ انسانی تجربے کے صحیح ترین جائزے سے بالا اور پرے کوئی معیار مقرر کرنے کی جسارت کرتے ہیں انہیں زیادہ معتبر دلائل پیش کرنی چاہئیں اگر وہ اس شبہے سے بچنا چاہتے ہیں کہ وہ معیار جسے وہ ماورائے فطرت معیار کے بھیس میں پیش کر رہے ہیں ان کی اپنی اختراع ہے۔ انسان شروع ہی سے اپنا تجربہ آنے والی نسلوں کو منتقل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ ایسے تجربات جو اسے مفید معلوم ہوئے انہیں اس نے اخلاقی اور عمدہ جان کر عزیز رکھا، یعنی ایسے عمل جو اسے کرنے چاہئیں۔ وہ تجربے جو اسے غیر مفید ثابت ہوئے انہیں اس نے بد اور غیر اخلاقی جانا، یعنی ایسے عمل جو اسے نہ کرنے چاہئیں۔ ہر ثقافت کے اخلاقی معیاروں میں عمل اور احتراز کے یہ اشارے محفوظ ہیں۔ ان معیاروں کو برقرار رکھنے کے لئے بعض اوقات جشن منائے جاتے ہیں اور انہیں بہ تکلف رواجی اور مذہبی رسوم کے ذریعے دل نشین کرایا جاتا ہے اور انہیں مافوق الفطرت ماخذ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن ہر چیز کا ماخذ ہمیشہ خود انسان وا لاتعام

رہا ہے اور فطرت بھی جس کا وہ ایک جزو ہے۔ اب تک جو اس میں کمی رہی ہے وہ تھی انسانی تجربے کے مشاہدے، ضبط، تعمیم اور تشریح کے معتبر طریقے کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس نے صدیوں سے اپنی تاریخ اور تجربے کے لغو اور عجیب و غریب تصورات اپنے اوپر سوار کر رکھے ہیں جن سے اخلاق " اقدار " اور ادارے مسخ ہو کر رہ گئے ہیں۔ سائنس ان غلطیوں کی تصحیح کا ایک قابل اعتبار طریقہ مہیا کرتی ہے۔

لہٰذا یہ درست ہے کہ سائنس ہمیں نہیں بتاتی کہ ہماری احتیاجات کیا ہونی چاہیئے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ سائنس عملی طور پر انسانی اقدار سے برتاؤ نہیں کر سکتی۔ متبادل طریقہ ہائے عمل کے نزدیکی اور دوری عواقب کے معتبر تخمینے مہیا کر کے سائنس انسان کے انتخابوں اور اقدار کی شرط سازی کرتی ہے۔ فن کاروں اور پیش بینوں کے خوابوں کا ایسا جائزہ لینے سے ہی ہم ان محرومیوں اور اعصابی امراض سے محفوظ رہ سکتے ہیں جو آج کل لاحاصل امنگوں، بے بنیاد اعتقادوں، عجیب و غریب آرزوؤں اور متضاد مقاصد کے حصول کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔

یہ ہمیشہ شاعر کا حصّہ رہے گا کہ وہ دنیا کی پہلے اینٹ سے اینٹ بجا دے اور پھر اپنی دلی خواہش کے مطابق اس کی تعمیر نو کرے۔ تاہم خود شاعروں نے بھی تسلیم کیا ہے کہ ایسا کرنے کے لئے پہلے دنیا کی افسوس ناک حالت کا کچھ علم ضرور ہونا چاہیئے۔ انہیں ایسا علم ہو یا نہ ہو

یہ فلسفیوں اور شاعروں کا بہرحال حصہ رہے گا کہ پسندیدہ زندگی کے اپنے تصورات لوگوں کے سامنے پیش کریں اور انہیں اس کے حصول کی کوشش میں اپنے ساتھ شامل ہونے کی دعوت دیں۔ لیکن یہ فرض کر لینا بے وجہ ہے کہ تمام زمانوں، مقاموں اور انسانی حالتوں کے لئے کوئی ایسی چیز ہے جسے واحد پسندیدہ زندگی کہہ سکیں۔ غالباً صرف اجتماعیت پرست ہی ایسے پرشکوہ مفروضے پر یقین رکھ سکتے ہیں۔ ایسے نصب العین غیب دان یا ولی کے دماغ سے بنے بنائے پیدا نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ کشف شدہ صغری کبری سے خالص منطق کے ذریعے مستنبط ہوتے ہیں۔ پسندیدہ زندگی کے تصورات انسان کے ہزاروں سالہ تجربے سے پیدا ہوتے ہیں۔ عمرانیات وہ سب سے کارگر آلہ ہے جس سے اس تجربے کی نوعیت معلوم ہوسکتی ہے اور یہ پتا چل سکتا ہے کہ جہاں تک موجودہ قابل حصول مقاصد کا تعلق ہے اس کی کیا اہمیت ہے۔ سائنس محض لوگوں کے متخیلہ کو آزاد، تیز اور منضبط ہی نہیں کرتی بلکہ ہمیں اپنے نصب العینوں کے متعلق یہ بھی بتاتی ہے کہ ان میں سے کون سے قابلِ حصول ہیں اور کس لاگت پر۔ ایسے سوالوں کے جواب دے سکنے کا قابل اعتبار طریقہ نہ ہونے کی وجہ سے نزاع، محرومی اور یاس پیدا ہوتی ہے۔

باب-۶

جو لوگ غلطی پر ہیں اُنکے ساتھ زندگی کیسے بسر کی جائے

۱- مذہبی جنگوں کا اختتام

ہم گذشتہ ابواب میں مل جل کر زندگی بسر کرنے کے مسائل حل کرنے کے بعض طریقوں کا جائزہ لے چکے ہیں۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انہیں حل کرنے کا عام طریقہ جسے ہم فطری سائنس کہتے ہیں اور جس کا اطلاق ہمارے معاشرتی اور طبیعی دونوں طرح کے حالات پر ہو سکتا ہے سب سے زیادہ امید افزا ہے۔ لیکن اگر مذکورہ سائنسی ترقیاں رونما ہو بھی جائیں تو بھی یہ ماننا پڑے گا کہ افراد اور جماعتوں کے درمیان فلسفہ ہائے حیات (مذاہب، اقدار، میلانات، تصورات، کائنات) کے اختلافات باقی رہیں گے۔ چنانچہ ہمیں ماننا پڑے گا کہ دنیا ہمیشہ مختلف العقائد ہی رہے گی۔ یکسانیت کی حامل ثقافت میں ان میں سے بعض اختلافات

نہ صرف روا رکھے جائیں گے بلکہ تنوع، تفریح اور جمالیاتی تشفی جیسا کرنے کے لئے ان کی حوصلہ افزائی بھی کی جائے۔ لیکن باقی انحرافات نہایت قبیح اور ناقابلِ برداشت یا کم از کم محض غلط سمجھے جائیں گے۔ کیا سائنس ایسے لوگوں کے ساتھ جو "غلطی پر" ہوں مل جل کر زندگی بسر کرنے کا طریقہ بتا سکتی ہے؟

اس مسئلے کی نوعیت ایک بیان سے ظاہر ہوتی ہے جو حال ہی میں ریاست ہائے متحدہ امریکا کی سینیٹ میں دیا گیا۔ سینیٹ کے ایک رکن نے دھواں دھار تقریر کرتے ہوئے کہا: "جو ہمیں امریکی ہونے کی حیثیت سے کہنا چاہیئے اور واشگاف الفاظ میں کہنا چاہیئے یہ ہے کہ ہم حق پر ہیں"۔ لاکھوں امریکیوں کے لئے یہ جاننا یقیناً باعث تسکین ہوگا کہ اس غیر یقینی دنیا میں اور دوسروں کے ساتھ ہمارے تنازعوں میں کچھ بھی ہو ہم ہمیشہ حق پر ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہماری تعریف کے مطابق مسئلہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ (۱) ہم اپنے حریفوں کو یہ ماننے پر کس طرح آمادہ کریں کہ ہم حق پر ہیں اور وہ غلطی پر ہیں، (۲) اس اثنا میں ان لوگوں کے ساتھ جو ہمیں غلطی پر دکھائی دیتے ہیں زندگی کیسے بسر کی جائے۔ جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے اعصابی جنگ میں گاہے گاہے وقفوں کے باوجود مستقبل قریب میں اس کا کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا کہ طرفین میں سے کوئی بھی اپنے نقطہ نظر میں تبدیلی کرے گا۔ لہٰذا ہم اسے پسند کریں یا نہ کریں معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصے کے لئے

دونوں حریفوں کو ایسے لوگوں کے ساتھ رہنا پڑے گا جنہیں وہ غلطی پر سمجھتے ہیں۔ اس باب میں ہم ایسی زندگی بسر کرنے کے طریقوں پر غور کریں گے۔

یہ صورت حال نامانوس نہیں ہے۔ ہم میں سے تقریباً ہر ایک کو ایسے اشخاص کے ساتھ رہنے کا تجربہ ہے جنہیں ہم غلطی پر سمجھتے ہیں۔ بیشتر عائلی تنازعے اور جماعتی اختلافات اس طرح پیدا ہوتے ہیں کہ لوگ ایک دوسرے کو غلطی پر سمجھتے ہیں۔ خارجی تعلقات کی نازک صورت حال کی وجہ یہ ہے کہ ہم اُن روایتی طریقوں سے بھی فائدہ اُٹھانے پر رضامند نہیں ہیں جنہیں ایسے حالات میں ہمیشہ کامیابی سے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ ایسے طریقوں کو بالعموم مصالحت، تحمل اور رواداری کہا جاتا ہے۔ یہ اعمال اپنی بہترین صورت میں حالات کا زیادہ محتاط اور صحیح جائزہ لینے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مذہبی جنگ وجدال سے دست برداری میں ایسے ہی تدبر کا ہاتھ تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی جنگوں کی کئی صدیوں کے بعد ان کے بالفعل قائد اس نتیجے پر پہنچے (جو تیس سالہ جنگ ختم کرنے والے معاہدہ ولیسٹ فالیہ سے ظاہر ہے) کہ ایسے لوگوں کے ساتھ جنہیں غلطی پر سمجھا جاتا ہے پورے امن و امان سے رہنا ممکن ہے۔ ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ آیا تیس سالہ جنگ کی مبینہ مذہبی وجوہات فی الواقع اس کی "حقیقی" وجوہات تھیں یا نہیں۔ یہ بات مسلم ہے کہ سترہویں صدی میں اہل یورپ کے لئے گناہ سے، یا غلط عقیدہ

رکھنے والے لوگوں سے مصالحت کرنے کی بڑی سخت ممانعت تھی لیکن اس کے باوجود دنیوی حکمران مذہبی مناقشات کا ایک طرح کا دیرپا عارضی تصفیہ کر سکے اور انہیں یہ بھی محسوس نہ ہوا کہ اس مصالحت میں کوئی غیر معقول بات ہے۔

ہم ابھی تک سیاسی معاشی نظام افکار و اعمال میں ایسا توافق حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے جو ہم نے خوش قسمتی سے مذہب کے میدان میں حاصل کر لیا ہے۔ مصالحت کو "جی حضوری" کا مترادف ٹھہرا کر اور اسے کھلی بد اخلاقی یا کم از کم بالکل بے کار چیز کہہ کر ہم نے اپنے آپ کو موجودہ اعصابی جنگ سے پیدا شدہ صورت حالات سے نمٹنے کے تاریخی طریقہ ہائے کار سے محروم کر لیا ہے۔ الغرض تاریخ کہے گی کہ بیسویں صدی کے ممتاز مدبر مذہبی مخالفوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی نسبت سیاسی معاشی مخالفوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے کم قابل تھے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب جبری تبدیلیٔ مذہب اور تعزیر ارتداد کی جگہ مذہبی رواداری نے لی تو عبوری دور میں اس کی شدید مخالفت نہیں ہوئی۔ اس وقت کے پوپ نے پراٹسٹنٹوں کی تائید کے ساتھ معاہدۂ ویسٹ فالیہ کی مذمت کی اور کہا کہ "یہ کالعدم ہے۔ لعنت ہے اور اس کا ماضی، حال یا مستقبل پر کوئی اثر نہیں"۔ مذہبی حلقوں میں مذہبی جنگ کے حق میں بڑا شور اٹھایا گیا لیکن اس کے باوجود کیتھلک اور

پر اٹسٹنٹ حکمران دونوں عقایدی جنگ کے مالی بار اور غیر افادیت کے اتنے قائل ہوچکے تھے کہ انہوں نے مزید مذہبی اور تصوراتی جنگوں سے کنارہ کشی کرلی۔

سرحدی، علاقائی، تجارتی اور دوسرے تنازعوں پر جنگیں ہوتی رہیں کیونکہ جب تک تصفیے کے زیادہ موثر اور کفایت شعارانہ ذرائع مہیا نہ ہوجائیں بدلتی دنیا میں توافق بحال کرنے کے لئے جنگیں ہوتی رہیں گی۔ اس کے علاوہ کئی ملک اور جماعتیں مذہبی عقاید کے باعث ہمیشہ داخلی خلفشار کا شکار رہی ہیں۔ لیکن گذشتہ دو صدیوں کی بین اقوامی جنگیں بنیادی طور پر تصوراتی نہ تھیں۔ سال ۱۹۱۷ میں ریاست ہائے متحدہ امریکا نے وڈرو ولسن کے اخلاقی تازیانے کے ڈر سے اصول منرو کی تاریخی پالیسی کو بدل دیا اور مذہبی جنگ کی طرف رجعت کی۔ جمہوریت بمقابل اشتمالیت کا تنازعہ اسی نوعیت کا ہے۔ موجودہ غالب سیاست کی تہ میں جو ذہنی میلان کارفرما ہے اور اس کی قرون وسطی کی مذہبی جنگوں سے جو مشابہت ہے اس کی چند مثالیں مذکورہ بالا اظہارات کی وضاحت کریں گی۔

۲۔ مذہبی قومی پالیسی

دسمبر ۱۹۵۶ کی ہارپرز میگزین میں "وڈرو ولسن اور اس کے رفقا" کے عنوان سے ریمنڈ بی، فاسڈک اپنے سابق رہنما کی تعریف میں یوں گویا ہے:

"ولسن دل سے مذہبی تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ دنیا میں خدا اپنے ارادے پورے کر رہا ہے۔ چنانچہ جب وہ فیصلہ کر لیتا کہ کوئی خاص طریق کار خدا کی مرضی کے مطابق ہے تو کوئی طاقت اسے اس سے منحرف نہ کر سکتی تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ خدا ہمیں مصالحت سے بچائے اور آؤ ہم مصلحت کا خیال چھوڑ دیں اور یہ دیکھیں کہ صحیح راستہ کون سا ہے۔ جب میں اس کے مرنے سے چند ہفتے پہلے اس سے ملا تو ہم نے جمعیت اقوام پر تبادلۂ خیالات کیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اس نے کہا تم خدا کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس کے نزدیک جمعیت اقوام کا ظہور میں آنا تقدیر کے ماتحت تھا اور اگر وہ اس کی تاسیس میں اپنا کچھ حصہ سمجھتا تھا تو یہ کہ وہ منشائے ربانی کا محض ایک ادنیٰ ذریعہ تھا۔"

یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ جب ولسن نے مندرجہ بالا بات کہی تو وہ بوڑھا اور بیمار تھا اور بہر حال کلیسا کے بڑھتے ہوئے دنیاداری رجحان کے زیر اثر ایسے عقیدے پچھلے تیس برس میں بتدریج کم ہو گئے ہیں۔ تو آیئے ہم معاصر صورت حالات سے چند مثالیں لیتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اقتباس کابینہ کے ایک ایسے رکن کی تقریر سے ہے جو اپنے عنفوان شباب میں ہے، گو نا گوں قابلیتیں رکھتا ہے، قانون کا سابق پروفیسر ہے اور میتھوڈسٹ کلیسا سے منسلک ہے:

"اگر انسان اپنے آپ کے متعلق صحیح رائے قائم کرنا چاہتا ہے

تو وہ معیار جن کا اطلاق وہ اپنے کردار پہ کرے گا لازمی طور پر ایسے ہوں گے جنہیں نہ وہ تبدیل کر سکتا ہے نہ ان کی تعریف کر سکتا ہے۔ اگر انسان اپنے معیاروں کی تعریف کا اختیار رکھتا ہو تو یہ کم و بیش یقینی ہے کہ وہ اس کی مرضی کے مطابق ہوں گے۔ انسان میں ہر تصور کو اپنی خواہش کے مطابق ڈھالنے کا میلان اتنا زیادہ ہے کہ کئی دروغ حق معلوم ہو سکتے ہیں، فریب شرافت کی صورت اختیار کر سکتا ہے اور انصاف کے نام پر ظلم کیا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک مادیت، انسیت اور تمام ایسے فلسفوں کی جو اخلاقی اور روحانی اقدار کی مستقل حیثیت تسلیم نہیں کرتے یہ بڑی اخلاقی غلطی ہے۔۔۔۔ یہ اقدار روحانی اور مطلق ہیں نہ کہ مادّی اور اضافی۔۔۔۔۔ وہ انسانی نشوونما کے دائرے سے خارج ہیں۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ ان اقدار کو اپنے خدا کا دائم، قائم اور غیر متغیر نظام سمجھے۔ اسے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ اس کے اپنے دماغ کی ملک ہیں اور وہ انہیں اپنی مصلحتوں کی خاطر موڑ توڑ سکتا ہے۔۔۔ ہم اس بنا پر روحانی اقدار کے الوہی ماخذ کا ادعا کرتے ہیں اور ساتھ ہی اس یقین کا اظہار کرتے ہیں کہ انسان ان اقدار کو زیر و زبر کرنے کا مجاز نہیں۔۔۔۔۔"

مذکورہ بالا سطور میں جس ذہنیت کی جھلک دکھائی دیتی ہے اس کی اس سے کیا نسبت ہے جو تین یا چار صدیاں پہلے کی مذہبی جنگوں کی تہ میں تھی؟ اس کا جواب اُس جواب سے بہتر نہیں ہو سکتا جو واشنگٹن میں برطانیہ کے سفیر سر آلیور فرینکس نے دیا تھا۔ جان فاسٹر ڈلس کی

مدح میں سر آئیور نے کہا:

"تین یا چار صدیاں پیشتر، جب مذہبی جنگوں کے دور میں تحریک اصلاح دین مسیحی اور جوابی تحریک اصلاح دین نے یورپ کو دو مسلح کیمپوں میں تقسیم کر دیا تھا، ڈلس ایسے اشخاص کافی تعداد میں تھے۔ ان کی طرح قوی اور مسلسل غور و خوض کے بعد وہ اٹل مذہبی اور دینیاتی نتائج پر پہنچا تھا۔ ان کی طرح وہ بھی دنیا کو ایک ایسا محاذ سمجھتا تھا جہاں خیر و شر کی متواتر جنگ رہتی ہے۔ ان کی طرح اس کا عقیدہ بھی تھا کہ یہ جنگ انتہائی اہمیت رکھتی ہے۔

"یہ کوئی خیالی مشابہت نہیں۔ مجھے یقین ہے جان ماسٹر ڈلس کا ایمان تھا کہ وہ اس وقت وزیر خارجہ بنا جب دنیا اخلاق عقیدوں اور مابعد الطبیعیاتی اصولوں کی بنا پر دوبارہ کیمپوں میں بٹ گئی تھی۔ وہ آزاد اقوام اور اشتمالیت کی آویزش کو اسی روشنی میں دیکھتا تھا۔ وہ بین اقوامی سیاسی مسائل کو اخلاقی نقطہ نظر سے دیکھتا تھا کیونکہ وہ انہیں دینیاتی مسائل سمجھتا تھا..... ایسے شخص کے لئے تفکر اور عمل مصلحت اندیشی پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک استنباطی عمل ہوتا ہے جو معلوم اصولوں کا حقائق پر اطلاق کر کے مقررہ منزل مقصود کی طرف راستہ دکھاتا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ ملاقاتوں میں یہ نتیجہ نکالا کہ ڈلس کا دماغ بنیادی طور پر اس طرح کام کرتا تھا۔ یہی وجوہات تھیں کہ وہ محکمۂ خارجہ کے مشوروں پر زیادہ کان نہیں دھرتا تھا۔" (لندن ٹائمز، ۳۱ مئی ۱۹۵۹)

مندرجہ بالا اقتباس میں سب سے زیادہ معنی خیز جملہ غالباً یہ ہے کہ "ایسے شخص کے لئے تفکّر اور عمل مصلحت اندیشی پر مبنی نہیں ہوتا" اور ہم اضافہ کر سکتے ہیں کہ مختلف ممکن طریقہ ہائے کار کے مصارف اور عواقب کے سائنسی تخمینے پر بھی مبنی نہیں ہوتا۔ بالفاظ دیگر ایسے شخص کے لئے صرف ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے یعنی کہ وہ "مصالحت" کے خلاف اور "صحیح راستے" کے حق میں اعلان کرے۔ لیکن ہمیں یہ کیسے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح راستہ کون سا ہے؟ اس کا جواب سکریٹری اینڈرسن نے غیر مبہم الفاظ میں اور قابلِ تعریف دیانت داری سے دیا ہے: "انسان یہی کر سکتا ہے کہ وہ خدا کے دائم اور غیر متغیّر کاموں کو ہی صحیح اصول سمجھے۔"

موجودہ مغربی دنیا اور بالخصوص ریاست ہائے متحدہ کی خارجہ پالیسی کا اب بھی یہی بنیادی اصول ہے۔ لیکن جب سے ہم نے اس پالیسی پہ عمل شروع کیا ہے (۱۹۱۷) اس کے نتائج نمایاں طور پر مایوس کن ثابت ہوئے ہیں۔ ہم اس کے کون سے متبادل پیش کر سکتے ہیں؟

۳۔ دنیا کا معاشرتی منظر

کسی متبادل پالیسی کے قابل لحاظ ہونے کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ وہ جنگ سے رجوع کئے بغیر اہم سوالوں پہ اتفاق حاصل کرنے کا طریق کار مہیا کرے۔ اس کے علاوہ ایسی پالیسی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ افراد کے روحانی، تصوراتی، مذہبی رجحانات یعنی ان کے "فلسفۂ حیات" میں کم سے کم دخل اندازی کرے۔ ان

میدانوں میں جہاں ایسی پالیسیاں آزمائی گئی ہیں وہ کون سے طریقہ ہائے کار اور آلے وضع کئے گئے ہیں جن میں یہ تقاضے پورے کرنے کی صلاحیت معلوم ہوتی ہے؟

اعلیٰ ترقی یافتہ طبیعیاتی سائنسوں (مثلاً طبیعیات اور کیمیا) کا اہم ترین خاصہ یہ ہے کہ طبیعی اور کیمیائی کے جواب جو وہ مہیا کرتی ہیں ان کی صحت پر اتفاق کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ لیکن جہاں تک بنیادی اقدار اور فلسفہ ہائے حیات کا تعلق ہے سائنس دان زیادہ سے زیادہ اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں تین ممتاز سائنس دانوں کا شدید اختلاف رائے ملاحظہ کیجئے۔

سب سے پہلے برٹرنڈرسل کا مختصر اور واضح قول سنئے:

"میں سب مذہبوں کا مخالف ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ہر قسم کا مذہبی عقیدہ مٹ جائے گا۔"

دوم، ایلبرٹ آئن سٹائن کا قدرے تفصیلی بیان یہ ہے:

"کوئی شخص حوادث کی باقاعدگی کا جتنا زیادہ قائل ہوگا اتنا ہی محکم اس کا یقین ہوگا کہ اس باقاعدگی کی موجودگی میں مختلف نوعیت کے علل کی گنجائش نہیں۔ اس کے نزدیک ارادۂ انسانی نہ ارادۂ ایزدی کی فطری حوادث کے مستقل علل کی حیثیت سے کوئی ہستی ہے۔ ... اخلاقی خیر کے حصول کی کوشش میں مذہبی رہنماؤں کو اتنا بلند ہمت ہونا چاہیئے کہ وہ ایک شخصی خدا کا عقیدہ ترک کر دیں۔ ... جس کسی کو سائنسی

تفکّر کے میدان میں ترتیبوں کا شدید ذاتی تجربہ ہے وہ کائنات میں معقولیت کا دور دورہ دیکھ کر احترام کے جذبے سے لبریز ہوجاتا ہے اور اس فہم کے ذریعے وہ ذاتی امیدوں اور خواہشوں کے بندھنوں سے بڑی حد تک آزادی حاصل کر لیتا ہے اور کائنات میں مضمر عقل کے جاہ وجلال کے سامنے اس میں ذہنی انکسار پیدا ہو جاتا ہے جس کے بغیر انسان کائناتی عقلیت کی اتھاہ گہرائیوں تک غوطہ زنی نہیں کر سکتا۔ لیکن میں اسی رجحان کو بلند ترین معنوں میں مذہب سمجھتا ہوں۔"

آخر میں فلیکس مینکس کا مندرجہ ذیل بیان ملاحظہ کیجئے:- یہ جیاتیات پر ایک مقالے سے نقل کیا جاتا ہے جو اس نے INTERNATIONAL ENCYCLOPEDIA OF UNIFIED SCIENCE (متحدہ سائنس کا بین الاقوامی انسائیکلو پیڈیا) کے لئے لکھا تھا جس کی مشاورتی کمیٹی کا ایک رکن برٹرینڈ رسل ہے:

" تصوّر کائنات اور فلسفۂ حیات سے ہم یہاں انسان کی روحانی زندگی کے دو واضح پہلو مراد لیں گے۔ تصوّر کائنات سے ہماری مراد ہو گی کائنات کا مجموعی تصوّر جو ہم تجربی سائنس کے نتائج سے وضع کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔ اس کے برعکس فلسفۂ حیات سے ہماری مراد ہو گی انسان کی تمام جذباتی جدو جہد اور تصوّرات کا مجموعہ،

اس کی اقداری آرا، اس کے اخلاقیاتی اور جمالیاتی عقائد.... راقم کے دل میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر فلسفۂ حیات یقین اور اعتماد پر مبنی ہوتا ہے جو انسان کو صرف داخلی تجربے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے.... لہذا فلسفۂ حیات اور تصوّر کائنات کا امتزاج جو ہر زمانے اور ہر شخص کا روحانی فریضہ ہے محض تجربی سائنس کا سوال نہیں ہوتا بلکہ ایمان کا سوال ہوتا ہے۔ اس مقالے کا راقم جو کیتھلک عیسائی ہونے کی حیثیت سے ایک مثبت عقیدہ رکھتا ہے اس امتزاج کو روحانی زندگی کا معراج کمال سمجھتا ہے۔"

کیا یہ ممکن ہے کہ وہ خلیج جو آئزن ہاور اور خروشچیف (یا کارل مارکس اور ٹامس ایکوینا سس) کے درمیان ہے وہ اس سے زیادہ پاٹ دار ہے جو رسل اور مینکس کے درمیان ہے؟ لیکن اس کے باوجود دونوں، اور میانہ رو آئن شٹائن، ہمارے سامنے طبیعی کائنات کا قابل اعتبار تصور پیش کرنے کے ایک ہی طریقے پر متفق ہیں۔ تصور کائنات پر اس اتفاق کے نتیجے میں یہ تینوں اس پر بھی بڑی حد تک متفق ہو سکتے ہیں کہ انسان ایسی کائنات میں جو کچھ کرے گا اس کے مصارف اور عواقب کیا ہوں گے۔ اس کے بعد ان مصارف اور عواقب کو لوگوں کے اپنے اپنے قدری نظاموں کے مطابق پرکھا جا سکتا ہے۔ ان حالات میں ہم جو انتخاب بھی کریں گے وہ کم از کم سوچا سمجھا اور مناسب

ہو گا۔

سیاسی، معاشی اور معاشرتی میدانوں میں انسانی عمل کے جو نتائج ہو سکتے ہیں انہیں جانچنے کے کسی قابلِ اعتبار طریقے پر ایسا اتفاق موجود نہیں۔ مثلاً معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی کو دو محاذوں پر جنگ کی توقع نہ تھی۔ امریکا کا یہ خیال کہ وہ دنیا کو جمہوریت کے لئے محفوظ کر دے گا پہلی عالمی جنگ میں ہماری شمولیت کے نتائج کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ یہ دہرانے کی ضرورت نہیں کہ ہمارا دوسری عالمی جنگ کے عواقب کا اندازہ غلط تھا۔ ان غلطیوں کی ایک وجہ یہ تھی کہ ہمارے پاس کوئی مشترک معاشرتی تصور کائنات نہ تھا، (اور اب بھی نہیں ہے) اور نہ ہی ہم ایسے تصور کی تشکیل کا کوئی متفقہ طریقہ جانتے تھے۔

میں نے یہ نہیں کہا کہ اگر ہم معاشرتی تصور کائنات پر متفق ہو جائیں تو ہم لازمی طور پر معاشرتی مقاصد پر بھی متفق ہو جائیں گے۔ ہمارا مشترکہ طبیعیاتی تصور کائنات ہمیں طبیعی مقاصد پر متفق نہیں کر سکا۔ گو ایٹم بم تیار کرنے کے طریقے پر اتفاق ہو گیا لیکن اس کے نتیجے میں متعلقہ سائنس دان کسی صورت بھی اس پر متفق نہ ہوئے کہ اسے ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرایا جائے یا نہیں۔ سائنس دانوں کا اس پر اتفاق ضرور ہوا کہ یہ بم گرانے کے نتیجے وہی ہوں گے جن کی پیش گوئی کی گئی تھی اور جو بعد میں دیکھے بھی گئے۔ میں نے صرف

یہ کہا ہے کہ ایک مشترک اور مسلم سائنسی منہاج کے استعمال سے انسانی معاشرے کا قابلِ تصدیق نظریہ مرتب ہو سکتا ہے۔ اور تمام ممکن کارگزاریوں کے نتائج کا صحیح تخمینہ ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ ان کے مصارف اور عواقب کا پیشگی علم ہمیں ایسی پالیسی اختیار کرنے سے باز رکھے جس کے متعلق ثابت کیا جا سکے کہ اس کے نتائج ہمارے محبوب نظام اقدار کے نقطۂ نظر سے مایوس کن ہوں گے۔

۴۔ بیوہاری علوم

معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں ایک غیر معین مدت تک ایسے لوگوں کے ساتھ گزر کرنی ہو گی جن کے انداز ہائے فکر اور بیوہار کو ہم غلط سمجھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے سے مختلف سیاسی اور صنعتی نظاموں اور قدری درجہ بندی پر اظہار تاسف کرتے رہیں گے۔ چنانچہ ضرورت ایک ایسی تدبیر کی ہے جس سے ہمارے لئے اختلافوں کے باوجود باہم زندگی کرنا ممکن ہو جائے۔ ہم یہ خیال ظاہر کر چکے ہیں کہ طبیعی دنیا کے متعلق اس قسم کا سمجھوتا طبیعیات سے حاصل ہو چکا ہے۔ سرعت سے ترقی کرتے ہوئے معاشرتی اور بیوہاری علوم کو بھی انسانی روابط کے سلسلے میں ایسا ہی کردار ادا کرنا ہوگا۔

یہ اس پر منحصر ہے کہ بیوہاری علوم کی ترقی بھی طبیعیاتی علوم جیسی ہوگی۔ اس پیش گوئی کی صداقت کا ثبوت انجام کار صرف

مستقبل ہی دے سکتا ہے۔ یہاں اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ بیوہاری علوم کو مستقل حیثیت حاصل ہوگئی ہے اور وہ ترقی کریں گے یعض ترقیاں جن کا انقلابی اثر ہوسکتا ہے اب بھی رونما ہورہی ہیں۔ مثلاً شمارندوں کی محیر العقول حالیہ ایجاد پر غور کیجئے جن کے ذریعے انسان ایسے سوال چند منٹوں میں حل کر سکتا ہے جنہیں ان مشینوں کے بغیر حل کرنے میں لسے ایک سو سال لگتے۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ صناعیاتی ترقیاں بذاتِ خود سائنس کی ترقی نہیں کر سکتیں تاہم طبیعیاتی اور حیاتیاتی علوم کے لئے ترقی یافتہ خردبینوں، دوربینوں اور لباریٹری کے سازو سامان کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ میلانات، اقدار اور رائے عامہ کی صحیح پیمائش کے طریقوں کی حالیہ ترقی کم معروف مگر انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ یا مثلاً معاشرتی علوم میں "لعبی نظریے" کی امکانی اہمیت پر غور کیجئے۔ اس نظریے کے مطابق کسی کھیل کی بنیادی شرائط میں یہ شامل ہوتی ہیں:

(۱) خطرہ اور نتیجے کا غیر یقینی ہونا، (۲) مفادات کا تصادم، (۳) تمام امکانی متبادلوں کو یقین اور (۴) کھلاڑیوں کی ترجیحات کے مطابق ان امکانات کو تقویت دینا۔ یہ امور کئی غیر لعبی معاشرتی حالات میں بھی فیصلہ کن ہوسکتے ہیں۔ اب "تصمیمی" "معلوماتی" اور "مراسلاتی" نظریوں میں بھی قابلِ لحاظ ترقی ہورہی ہے۔

ان زیادہ امید افزا میدانوں میں سے کئی بہت کٹھن ہیں اور ان کی تفتیش ابھی تک زیادہ تر اعلیٰ ریاضیات کے ماہروں ہی سے کی ہے۔ یہ کہنا کہ ایسے نظریے موجودہ باب کے عنوان میں پیش کردہ سوال کے جوابات مہیا کرسکیں گے غالباً ایسا ہی معلوم ہوگا جیسے اگر کوئی روٹی مانگے تو اُسے نہ صرف پتھری بلکہ بجری کا بھرا ہوا ایک ٹرک دے دیں۔ سائنس کے طریقے پیچیدہ اور مشقت طلب ہونے میں کافی بدنام ہیں۔ بہت سا بنیادی سائنسی کام عملی نتیجوں کی توقع مستقبل بعید میں رکھتا ہے۔ چنانچہ یہ تعجب انگیز نہیں کہ "ہم حق پر ہیں" کہہ دینا کم تکلیف دہ جواب معلوم ہوتا ہے۔ ایسے حل پر جو حال کے بعد کا زمانہ نگاہ میں رکھتا ہے کئی اعتراضوں میں سے ایک یہ ہے کہ (جیسا ایک معاشیات دان نے کہا) "انجام کار ہم سب مرجائیں گے"۔ یہ یقیناً درست ہے کہ انجام کار "ہم" سب مرجائیں گے لیکن معاشرتی علوم کا ایک وظیفہ بعینہٖ یہ ہے کہ وہ بتائے کہ جہاں انفرادی مدبر اور معاشیات دان انجام کار (شاید ہمارے بھاگوں) سب مرجائیں گے انسانی معاشرہ ہزاروں لاکھوں سالوں سے زندہ چلا آرہا ہے اور اٹیم بموں کے باوجود اس کے زندہ رہنے کا امکان ہے۔ ایسی قومی اور بین اقوامی پالیسیاں جو عہدہ داروں کے اپنے حین حیات یا حین منصب کے لئے وضع کی گئی ہوں مستقبل قریب میں بھی کارگر نہیں

ہوسکتیں جیساکہ اعصابی جنگ سے واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ کسی بھی پالیسی کے تحت روزمرہ کے توافعات ضروری ہوں گے۔ لیکن کوئی کامیاب قومی پالیسی محض دفع الوقتی اقدامات پر مشتمل نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ یہ بیوہاری علوم کی ترقی کے لئے "انتظار" کا سوال نہیں ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ جیسے ہم روزمرہ کے توافعات کرتے جاتے ہیں اس کے ساتھ ہی ہم بیوہاری علوم کو جس قدر جلد ممکن ہوسکے ترقی دیں۔

۵۔ اسلوب تعاون

ہم نے دو قسم کے سوالوں میں واضح امتیاز کیا ہے: (۱) وہ جن کا تعلق ترجیحات، امنگوں اور امیدوں سے ہے اور (۲) وہ جن کا تعلق قابل تصدیق، قابل پیش گوئی امور اور حوادث کے سلسلوں سے ہے۔ انتہا پسندانہ اشتمالیت اور سرمایہ داری پہلی قسم کی مثالیں ہیں۔ یعنی وہ ایسے فلسفہ ہائے حیات یا ترجیحات ہیں جنھیں سائنسی طریقہ ہائے کار کی بنا پر وضع نہیں کیا گیا۔ دوسری قسم کی مثال ایسا علم معاشیات ہوسکتا ہے جو معاشی سامان کی پیداوار، تقسیم اور صرف کے بارے میں علت ومعلول سے بحث کرے۔ ہم نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ فلسفہ ہائے حیات پر وسیع اختلاف کے باوجود باہم دگر زندگی اور تعاون ممکن ہے بشرطیکہ تجربی سائنس کے منہاجوں اور نتیجوں پر اتفاق ہو۔ ہوسکتا ہے کہ نام نہاد نظامہائے فکر

جو ہمیں آج کل اس قدر پریشان کر رہے ہیں جماعتی زندگی کے عملی پہلوؤں سے کوئی تعلق ہی نہ رکھتے ہوں۔

ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ فلسفہ ہائے حیات اور نظامہائے فکر کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ یہ سب جانتے ہیں کہ انتہائی صبر آزما وقتوں میں نہایت نامعقول نظامہائے فکر نے لوگوں کی ہمت بندھائی ہے۔ ہم نے صرف یہ کہا ہے کہ فلسفہ ہائے حیات پر وسیع اختلافات کے باوجود زندہ رہنا اور پرامن جماعتی زندگی بسر کرنا ممکن ہے۔ اس کے برعکس ترقی یافتہ صنعتی تمدن کے بعض مسائل میں ہر شخص کے لئے کسی حد تک اتفاق رائے ضروری ہوتا ہے، مثلاً سلامتیٔ عامہ، صحت، افزائش آبادی اور معاش کے متعلق۔

کیا ایسے سوالات کی ان دو قسموں میں تقسیم تاریخی نقطہ نظر سے درست ہے؟ ہم بتا چکے ہیں کہ مغربی دنیا میں مذہبی جنگیں ترک کرنے کے نتائج کیا ہوئے۔ معاہدۂ ویسٹ فالیہ نے نظامہائے فکر کے متعلق کوئی مصالحت نہ کی نہ ہی اس نے طرفین کو تبلیغ کرنے اور اپنا اپنا مذہب پھیلانے کی کوشش سے منع کیا۔ اس نے صرف بین اقوامی روابط کے متعلق عملی تدبیریں اختیار کیں اور تصوّراتی سوالات سے کوئی سروکار نہ رکھا۔ اس طرح مختلف مذہبی گروہوں کے ارکان کے لئے جماعتی زندگی میں رواداری ممکن ہوگئی جس کا نتیجہ آگے چل کر یہ نکلا کہ اب مختلف مذہبی فرقوں کے پیرو کھلم کھلا ترتپاک باہمی

تعلقات رکھتے ہیں۔

اس تپاک کا یہ مطلب نہیں کہ عقاید میں کوئی مصالحت ہو ئی ہے جب کیتھلک کلیسا دوسرے عیسائی فرقوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ واحد سچا مذہب قبول کریں تو وہ دوستانہ اور دردمندانہ طور پر ایسا کرتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیتا ہے کہ پراٹسٹنٹ ہیں دراصل صریح غلطی پر۔ پراٹسٹنٹ اس دعوت اور اس کے مضمرات کو شائستگی اور بردباری سے قبول کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ واضح کر دیتے ہیں کہ جب تک کیتھلک بعض غلط عقیدے ترک نہ کردیں کسی سمجھوتے پر غور نہیں کیا جا سکتا۔ اس دوران میں کیتھلک اور پراٹسٹنٹ دونوں عوامی مقاصد کے لئے جن پر وہ متفق ہوں کام کرتے رہتے ہیں اور کھلم کھلا عداوت شاذو نادر ہی ظاہر ہوتی ہے۔ ہر فرقہ دوسروں کو نرمی سے تبدیلیٔ مذہب پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ہر ایک کی کامیابی دوسرے کے نقصان سے ہوتی ہے۔ تصوراتی طور پر دونوں اعلان کرتے ہیں کہ ان کا آخری مقصد تسخیر عالم ہے، طاقت سے نہیں بلکہ ہر ایک کو جو ان کے عقاید کا پیرو نہیں قائل کر کے کہ وہ غلطی پر ہے۔ اسی قسم کا توافق اعصابی جنگ جیسی صورت حالات میں بھی کیوں نہیں ہو سکتا؟

ہم نے اپنی مادی ترجیحات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے طبیعیات اور کیمیا کے معاصر تصور کائنات سے فائدہ اُٹھایا ہے اور

اس کے نتائج ایسے شاندار ہیں کہ الکیمیا دانوں کے تصور کائنات کے تحت ہرگز نہ ہو سکتے تھے۔ اسی طرح یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنی تصوراتی اور روحانی ترجیحات کی تسکین کے لئے اس نئے معاشرتی تصور کائنات کا استعمال کریں جو بیوہاری علوم سے حاصل ہو۔ اب اگر یہ ترجیحات امن عالم، ہم آہنگی اور بین اقوامی رواداری ہوں تو تعاون اور مصالحت کا زیادہ ترقی یافتہ طریق کار ہماری ترجیحات کے حصول میں بے حد ممد ہو سکتا ہے۔

ہمارے ٹھوکریں کھانے کو اس بات کا اعتراف سمجھنا چاہیئے کہ ہم انسانی امور کے انصرام میں ناکام رہے ہیں نہ اس بات کا کہ ہمارے مخالف بدباطن اور ہیٹیلے ہیں۔ اس ناکامی کو کامیابی میں تبدیل کرنا معاشرتی اور بیوہاری علوم کا مقصد اور موزوں وظیفہ ہے۔

یہ نقطۂ نظر ان حلقوں میں بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا جہاں اس کی حمایت کی کم سے کم توقع ہو سکتی ہے FOREIGN AHAISS (امور خارجہ) رسالے میں ایک مضمون کے دوران میں خروشچاف نے کہا:

"کیا یہ ممکن ہے کہ جب انسان نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ وہ عظیم ترین انکشافات کے قابل ہو گیا ہے اور بیرونی خلاؤں کی طرف قدم اٹھا رہا ہے تو وہ اپنی گراں قدر دماغی کامیابیوں کو مستحکم امن اور خیر انسانی کے لئے استعمال نہ کرے بلکہ انہیں ایک اور جنگ کی تیاری

اور ان تمام چیزوں کی تباہی کے لئے استعمال کرے جو اس نے ہزارہا صدیوں کی محنت شاقہ سے حاصل کی ہیں ؟ عقل یہ ماننے سے انکار کرتی ہے۔"

اس بیان میں معنی خیز بات یہ ہے کہ "کمال قدر کامیابیاں" جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ ہیں جو عام طور پر تسلیم کردہ سائنس کی ہیں (جس میں کبھی بیوہاری علوم بھی شامل ہوں گے) اور سائنس بھی مشرق اور مغرب کی مشترک۔ یہ کامیابیاں کارل مارکس کی لغاظیوں کی نہیں ہیں اور نہ ہی لینن یا سٹالن کی۔ جب مغربی لیڈر بھی اپنے ذاتی عقیدے (یعنی "ہم حق پر ہیں") کے متعلق ایسا اعتراف کریں گے تو ان لوگوں کے ساتھ "جو غلطی پر ہیں" زندگی بسر کرنے کی صورت پیدا ہو جائے گی۔

باب ۔ ۷

خاتمہ

کیا سائنس ہمیں بچا سکتی ہے ؟ ہاں، لیکن ہمیں طبیعیات سے معاشرتی مسائل حل کرنے کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے ۔ ہم پنسلیں سے توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ آجر اور اجیر کے تنازعوں کا تصفیہ کر دے گی ۔ نہ ہی ہم برقی لیمپوں سے توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ تاریک ذہنوں اور جذبات کو منوّر کر سکیں گے ۔ ہم جوہری انشقاق سے توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ ہم پر معاشرتی جوہر کی نوعیت اور اس ضبط کا طریقہ منکشف کر دے گا ۔ اگر ہمیں بہتر انسانی روابط مطلوب ہیں تو ہمیں اپنی تحقیق کا رخ ان مسائل کے حل کی جانب پھیرنا ہوگا ۔

جو قاری ابھی تک شبہے میں ہیں اور عمرانیات کے امکانات سے متاثر نہیں ہوئے ان سے ہم پوچھتے ہیں کہ آپ کون سے زیادہ

امید افزا متبادل تجویز کرتے ہیں۔ اگر ہم عمرانیات پر اعتماد نہ کریں تو پھر ہم معاشرتی حلوں کی کہاں تلاش کریں ؟ پہلے باب میں ہم نے ان ذرائع کا جائزہ لیا تھا جن پر انسان نے ماضی میں آس لگائے رکھی۔ پچھلے باب میں اور کئی دوسرے مقامات پر ہم نے کہا ہے کہ غالب مروجہ انداز فکر اخلاقی قانونی ہے جو "قدرتی" (یعنی غیر معاشرتی) خدشوں، مشکلوں اور آفتوں کے متعلق ہمارے غیر جذباتی اور تحلیلی نقطۂ نظر سے شدید اختلاف رکھتا ہے۔ اخلاقی قانونی رویہ شروع ہی میں لوگوں کو صحیح یا غلط، نیک یا بد، جارحانہ یا غیر جارحانہ، امن پسند یا جنگ پسند وغیرہ گروہوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اس سیدھے سادے نقطۂ نظر سے یہ عام یقین پیدا کرنا آسان ہے کہ اقوامِ متحدہ کے منشور جیسی دستاویز کے ذریعے بین اقوامی ارتباط ممکن اور قریب ہو سکتا ہے۔ اس ادارے کی کوششوں اور کارگزاریوں کا استخفاف کئے بغیر ہمیں اس کے مقرر کردہ مقاصد کی روشنی میں اس کی مجبوریاں تسلیم کرنی چاہئیں۔

اس کتاب میں ہم نے "عالمی تنظیم" کے خلاف کچھ نہیں کیا ہے اور نہ ہی ہم نے سکولوں، ہسپتالوں اور دوسرے اداروں کی، جو مطلوبہ مقاصد کے حصول کے ذرائع ہیں، مخالفت کی ہے۔ ہم صرف اس افسوسناک امر کی طرف توجہ مبذول کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ طبیعی یا معاشرتی مقاصد حاصل کرنے کے لئے محض نیک

امدادے کارگر طریقہ ہائے کار کا بدل نہیں ہیں۔ جب یہ بات ایسے منصوبوں کے متعلق کہی جائے جن سے انہیں قلبی لگاؤ ہو تو اکثر لوگ اسے ناپسند کرتے ہیں۔ نیک امدادے بذاتِ خود نیک کام معلوم ہوتے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں ان کا کچھ نہ کچھ صلہ ملنا چاہیئے۔ علاوہ ازیں لوگوں کو یہ بتانا کہ نیک امداد بے صرف موزوں طریقہ ہائے کار اور بالخصوص سائنس ہی کے ذریعے بار آور ہو سکتے ہیں انھیں معاشرتی نجات کے عظیم کام میں حصّہ لینے سے محروم کر دیتا ہے۔ لوگ عام طور پر یہ نہیں جانتے کہ سائنسی نقطۂ نظر کی حمایت سے جماعتی زندگی میں شرکت تصوراتی اور جذباتی طور پر نفع بخش ہو سکتی ہے اور ہم سے اختلاف رکھنے والے لوگوں کو ان کے بد اخلاق پر وعظ و نصیحت کرنا لاحاصل ہے۔

معاشرتی تنظیم محض ایک ذریعہ ہے انسان کے مطلوبہ مقاصد کے حصول کا اور عالمی تنظیم اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ یہ اندھے جذبے کی نہیں بلکہ مخصوص تجاویز کی محتاط جانچ پڑتال کی مستحق ہے۔ سب سے پہلے یہ ملاحظہ کیجئے کہ "عالمی حکومت" کا تصور وغیرہ واضح اور گمراہ کن ہے اگر اس کی وسعت، حدود اور نوعیت واضح نہ کی جائیں۔ اکثر لوگوں کے نزدیک "عالمی حکومت" کے معنی غالباً ایک ایسی صورت حالات ہے جو موجودہ اہم قومی حکومتوں کے کم و بیش مشابہ ہے۔ لیکن جس طرح قومی حکومتیں اپنے شہریوں کی زندگیوں پر اختیار کے بارے

میں بڑی متنوع ہو سکتی ہیں اسی طرح عالمی حکومت بھی بہت کچھ ہو سکتی ہے یا کچھ بھی نہیں۔

عالمی تنظیم آخر کوئی نئی چیز تو ہے نہیں ۔ مختلف ملکوں کے باہمی تعلقات کے انصرام کا سوال ہمیشہ پیش نظر رہا ہے ۔ لیکن ان تعلقات کو کسی باقاعدہ فوق ملکی یا فوق قومی حکومت کے ذریعے منضبط کرنے کے خیال سے بہت پہلے بعض مخصوص تعلقات پر قابو رکھنے کے لئے مخصوص طریقے وضع ہو چکے تھے ۔ چنانچہ ۱۹۵۰ میں ایک ہزار سے زیادہ نجی بین اقوامی غیر حکومتی تنظیمیں تھیں جو ان شعبوں کا انتظام کرتی تھیں : تجارت اور مالیات ، مواصلات ، حمل و نقل ، سیاحت ، محنت زراعت ، فنون اور سائنس ، صحافت ، تعلیم ، مذہب ، معاشرتی بہبود ، کھیل کود ، قانون اور تنازعوں کا قانونی تصفیہ ، اور قیام امن ۔ دوسری ثقافتوں سے بڑھتے ہوئے روابط سے ایسے معاملات کی بین اقوامی تنظیم امن اور جنگ کے زمانوں میں ضروری ہو جاتی ہے ۔

یہ غالباً درست ہے کہ "عالمی تنظیم" سے موجودہ دلچسپی زیادہ تر ایٹمی جنگ کے خطرے کو کم کرنے سے تعلق رکھتی ہے ۔ اگر اقوام متحدہ صرف اس ایک مقصد میں کامیاب ہو جائے تو اس کی دوسری متعدد سرگرمیوں پر غالباً کوئی معترض نہ ہوگا ۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے بعض سرگرمیوں کے لئے بین اقوامی عمل ضروری ہے اور باقی کے لئے نہیں ۔ مثلاً ڈاک کا انتظام اور صحت عامہ ایسے مخصوص روابط

مختلف ثقافتوں کی حمایت حاصل کرنے میں نمایاں طور پر کامیاب رہے ہیں۔ ان کی بہت کم مخالفت ہوتی ہے کیونکہ یہ ایسے اہم شعبوں کا انتظام کرتے ہیں جو مسلمہ طور پر قومی تنظیم کی طاقت سے باہر ہیں۔ اس کے برعکس بین اقوامی قانون حقوق ایسی تجویزوں کے لئے فوری منظوری اور وسیع مقبولیت یا مؤثر نفاذ کا کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا۔ یہ سوال کہ آیا کسی افریقی سردار کو ایک سو بیویوں کی اجازت ہونی چاہیئے یا صرف ایک کی زیادہ تر اُسی قبیلے کی دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے جس میں کثرت ازدواج مروج ہے کیونکہ امریکا میں تو بہرحال صرف ایک ہی بیوی کی اجازت ہے یہ سوال مثلاً متعدی امراض کے بین اقوامی ضبط کے سوال سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ موخرالذکر کے متعلق ثابت کیا جا سکتا ہے کہ (۱) ان پر قابو پانا بین اقوامی تدابیر کے بغیر ممکن نہیں، (۲) دور دراز اور "خود مختار" قبیلوں پر ان کے اثرات تباہ کن ہوں گے۔ امن عالم ایک ایسا مقصد ہے جو "پس ماندہ" افریقی قبائل کے ازدواجی رواجوں سے متعدی امراض کے ضبط سے زیادہ قریبی مشابہت رکھتا ہے۔

متعدی امراض کی تباہ کاریاں جنگ کی عقوبتوں سے کم نہیں لیکن ان میں ایک نمایاں فرق ہے۔ بیماری کی روک تھام کے لئے خاص طریقہ ہائے کار اختیار کئے جاتے ہیں اور سائنسی علم بہت بڑی مقدار میں استعمال کیا جاتا ہے لیکن جنگ کے اسباب معلوم کرتے،

اسے روکنے اور محدود کرنے کے لئے کوئی ایسا تردد نہیں کیا جاتا۔ اِس وقت "عالمی تنظیم" ایک بڑے ہسپتال کی مانند ہے جہاں ہر طرف سرگرمی دکھائی دیتی ہے اور جو مستعد عملے سے پُر ہے لیکن جہاں اِس سائنسی علم کا فقدان ہے کہ معاشرتی روابط کے امراض میں کیا کرنا چاہیئے۔ ہم نے پہلے باب میں کہا تھا کہ معاشرتی مسائل کو سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے راستے میں ایک رکاوٹ یہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں ان کے حل پہلے ہی معلوم ہیں۔ آج کل کے مروجہ جوابات میں سے ایک مقبول ترین جواب وہ ہے جسے "عالمی تنظیم" کہتے ہیں۔ اکثر لوگوں کے خیال میں یہ الفاظ محض نئی علامتیں ہیں جن سے پرانی قسم کے اخلاقی قانونی انداز ہائے فکر کے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ نئی دعا، نئی اکسیر و انسانی اخوت کی "متحدہ دنیا" ہے جس سے معاشرتی صناعیات کے تمام بیزار کن سوال خارج کر دئے گئے ہیں اور جس کے متعلق انسان ہمیشہ خیال کرتا رہتا ہے کہ اب ملی کہ ملی۔ صدیوں سے انسان ایسی سرزمینوں کے خواب دیکھ رہا ہے جہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں اور اس نے اس مقصد کے حصول کے لئے حکومتوں، مذہبوں اور دوسری تنظیموں سے آس لگائے رکھی ہے۔ لیکن یہ احساس شاذ ہی ہوا ہے کہ اس خواب کو عملی جامہ پہنانے میں جو بھی ترقی ہوئی ہے وہ زیادہ تر سائنسی زراعت کی مشقت طلب نشو و نمائی مرہونِ منت ہے۔

آج کل ایک مقبول خیال یہ ہے کہ اگر کوئی مسئلہ جسے ہم مقامی گاؤں یا فیکٹری میں حل نہیں کر سکتے دنیا کے سٹیج پر لاکھڑا کیا جائے تو یہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ بین اقوامی نسلی اور اقلیتی مسئلوں پر لیکچر دینے والے کو کوئی بات اتنی برانگیختہ نہیں کرتی جتنا یہ مشورہ کہ پہلے وہ کسی مقامی جماعت میں مسئلوں کی نوعیت معلوم کر لے اور ان کے حل کا عملی ثبوت مہیا کرے۔ کیا صنعتی مسئلوں، آجر اجیر کی کش مکش، بے روزگاری کا حل مطلوب ہے؟ تو لیس بین اقوامی تجارت پر پابندیاں کم کر دیجئے اور محنت کی ایک بین اقوامی تنظیم بنا لیجئے۔ جن قوموں کی برآمدی تجارت زیادہ سے زیادہ خوش حال زمانوں میں بھی کل تجارت کے دس فیصد سے زیادہ نہیں ہوتی ان کے لیڈر بھی بہانگ دہل کہتے ہیں کہ اگر ہمیں بے روزگاری اور معیار زندگی میں کمی کو روکنے کے لئے اس دس فیصد کا تحفظ کرنا ہے تو ہمیں جنگ کرنی چاہیئے۔

اب ظاہر ہے کہ بہت ہی کم لوگ عالمی تنظیم کے فی الواقع مخالف ہیں جیسے بہت ہی کم لوگ امن، خوش حالی اور آسودگی کے مخالف ہیں۔ اگر سوال ہے تو صرف تنظیم کی نوعیت اور طریقے کا ہے اور ٹھیک اسی کے لئے محتاط اور سائنسی تحقیق کی ضرورت ہے۔ لیکن جب عالمی تنظیم کے مثالی منصوبوں کے علم برداروں کو ایسی تحقیق کا مشورہ دیا جاتا ہے تو وہ اسے ان منصوبوں کی تخریب سمجھتے ہیں۔ ہمیں

ان رنگ میں بھنگ ڈالنے والوں سے خبردار کیا جاتا ہے، خاص کر اُن سے جو اعلیٰ سرکاری عہدوں پر متمکن ہیں یا یونیورسٹیوں میں پروفیسر ہیں اور جو ہمیشہ یہ طفلانہ عذر پیش کرتے ہیں کہ " ابھی وقت سازگار نہیں "۔ اس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر قرون وسطیٰ میں ہوابازی کے حق میں کافی زبردست مہم کی جاتی اور لوگوں کی کافی تعداد اس کے حق میں ووٹ دے دیتی تو کولمبس اپنا جوکھوں کا سفر حقیر بادبانی جہاز کی بجائے شاندار ہوائی جہاز میں کرتا۔ لیکن سائنس دان یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ بدقسمتی سے اس کے لئے ابھی وقت سازگار نہیں۔ فولاد اور دروں سوز انجن کی تیاری میں بعض ترقیوں کا فقدان قوی سے قوی قومی تنظیم کو بھی ناکام بنا دیتا۔ یہ اس قسم کے عملی سوالات ہیں جو " متحدہ دنیا " کے حامیوں کو برانگیختہ کرتے ہیں۔

خود جنگ کئی قسم کی معاشرتی کشاکشوں کی علامت ہوتی ہے۔ یہ کشاکشیں قوموں کی طرح لاتعداد چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ہمیں ان کشاکشوں پر جو جنگ، جرم اور ہڑتالوں کے اسباب ہیں توجّہ کرنی چاہیئے نہ کہ محض علامتوں پر۔ علامتوں کو "خارج از قانون" قرار دے دینا مرض کا علاج نہیں ہے۔ کسی مسئلے کے حقیقی حل کے لئے اس کا گہرا سائنسی تجزیہ لازم ہے۔ دراصل ہماری تمام ترقی اسی کی مرہون منت ہے۔ پہلے لوگ عیسیٰؑ کے ظہور ثانی پر ایمان رکھتے تھے۔ اب اس کی جگہ عالمی تنظیموں کے معجزوں پر ایمان نے لے لی ہے۔ ہم

صنعتی انقلاب کے منتظر معاشرتی انقلاب کا انتظار کر رہے ہیں۔ جس کے لئے اس جیسا اُکتا دینے والا، غیر ڈرامائی اور صناعیاتی کام نہ کرنا پڑے۔

اس توقع کی ہرگز کوئی وجہ نہیں کہ کسی بھی تنظیم کے ماتحت ہر قسم کی جنگیں دفعتہً صفحۂ ہستی سے محو ہو جائیں گی۔ ہم معقولیت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ یہ امید کر سکتے ہیں کہ وہ بتدریج کم ہو جائیں گی۔ وسعت پذیر علاقائی اکائیاں، جن کے اندر نسبتی امن موجود ہے، ظہور میں آ رہی ہیں باوجودیکہ ہم بعض مقامات پر اس کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا کے اشتمال اور اس کے نصف کرہ غربی پر غلبے کا نتیجہ دنیا کے اس حصے میں ڈیڑھ صدی کا امن ہوا۔ اب یہ عمل روس اور اس سے ملحقہ علاقوں میں جاری ہے۔ اگر اس عمل میں بیرونی مداخلت نہ ہوتی تو دہائیاں پہلے یورپ متحدہ اور نسبتہً پرامن خطے کی حیثیت سے ظاہر ہو گیا ہوتا۔

میں یہاں دوام جنگ کے حق میں دلیل پیش نہیں کر رہا۔ میں اس امکان کی طرف توجہ مبذول کرا رہا ہوں کہ طبیعیاتی دنیا کی طرح معاشرتی دنیا میں بھی "فطری عمل" ہوتے ہیں اور اگر انسان کامیاب تنظیم اور امن کا خواہاں ہے تو ان عملوں سے من مانا سلوک کرنے کی ایک حد ہوتی ہے۔ کیا کوئی عوامیاتی، ماحولیاتی، معاشیاتی اور ثقافتی اصول ایسے ہیں جن سے معاشرتی تنظیم کو مناسب حدود میں مطابقت کرنی چاہیئے؟ کیا انسانی روابط کے انصرام کے کوئی ایسے

اصول ہیں جو اتنے ہی اہم ہیں جتنے پُلوں کی تعمیر کے اصول؟ اگر ہیں تو کیا وقت نہیں آگیا کہ ہم ان کی وضاحت کریں اور ان کا اطلاق شروع کر دیں؟ ایسے علم کے بغیر کوئی عالمی تنظیم اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مارنے سے زیادہ نہیں ہو سکتی اور نہ ہی ان کوششوں سے زیادہ جو پہلے ہو چکی ہیں ۔جب زیادہ کارگر طریقے موجود نہ ہوں تو اِدھر اُدھر ہاتھ پیر مارنا بھی جائز ہو سکتا ہے۔ اس کتاب نے اس کی مخالفت نہیں کی نہ ہی کوئی اپنا عالمی منصوبہ تجویز کیا ہے۔ میں نے صرف یہ کہا ہے کہ اس مسئلے کے حل کے لئے ہمیں سائنس کے آزمودہ منہاجوں کا استعمال کرنا چاہیئے۔

حصول مقاصد کے سائنسی علم کے بغیر "تصوراتی" نشرو اشاعت محض خود فریبی ہے۔ گو ایک اور اظہار برہمی کا اجلاس، چند اور کیلاگ معاہدے "چوٹی" کانفرنسیں یا عالمی "منشور" اپنی اپنی جگہ کچھ اہمیت کے حامل ہو سکتے ہیں لیکن وہ موجودہ عالمی صورت حال کا علاج نہیں ہیں۔ یہ صورت حال زیادہ بنیادی سلوک کی متقاضی ہے۔ کوئی عالمی تنظیم جو شروع ہی سے خود اپنی رہنمائی کے لئے سائنسی تحقیق کا وسیع انتظام نہیں کرتی ناکامی کو دعوت دیتی ہے۔ تنظیم سے کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا جب تک منتظمین یہ نہ جانیں کہ انہیں کیا کرنا چاہیئے اور انہیں ایسے اقدامات کے لئے جو مطلوبہ مقاصد کے پیش نظر موزوں ثابت ہو سکتے ہیں اقوامی حمایت کیسے حاصل

کرنی چاہیئے۔ ایسے سائنسی علم کے بغیر جو آج کل انجینروں اور طبیبوں کے پاس ہے ہم دنیا کے قابل سے قابل اور نیک نیّت منتظموں سے بھی اپنے فرائض خوش اسلوبی سے ادا کرنے کی توقع نہیں رکھ سکتے۔

کم و بیش یہی بات سیاسیات دانوں اور طبیعیات دانوں کے نتائج کے متعلق کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہہ کر پیش نظر مسئلے سے گریز کرنا چاہتے ہیں کہ "اصل مسئلہ لوگوں کے دلوں میں ہے"۔ یہ قول پادریوں وغیرہ نے اتنا زیادہ استعمال کیا ہے کہ صدیوں کی تکرار کے بعد یہ تسکین بخش اور یقینی معلوم ہونے لگا ہے۔ خاص کر ان کو جو ذہنی الجھن میں گرفتار ہیں اور سوچنے کی تکلیف نہیں اُٹھانا چاہتے۔ اس کتاب میں ہم بار بار کہہ چکے ہیں کہ جہاں تک سہل تر مواصلات اور حمل و نقل، اور جنگ، وبا اور قحط سے نجات کی خواہش کا تعلق تھا۔ "لوگوں کے دل" صدیوں تک ٹھیک حالت میں تھے۔ لیکن ان مصائب سے نجات دل کی تبدیلی سے نہیں ہوئی بلکہ دماغوں کے استعمال کے ایک خاص طریقے یعنی سائنسی منہاجوں سے۔ اگر عوام کے محض ارادے فیصلہ کن امور ہوتے تو جنگیں کبھی کی ختم ہو گئی ہوتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جنگ کے متعلق جو کچھ عوام کے دل میں ہے اس کا مناسب اظہار ابھی سائنسی علم اور اسالیب میں نہیں ہوا۔

ممکن ہے کہ جوہری انشقاق کے مسئلوں کے حل سے ایک اور صنعتی انقلاب رونما ہو جائے۔ ایسی صورت حال جو اثر معاشرتی نظام پر ہوگا اس پر طرح طرح کی خیال آرائیاں ہو رہی ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ اس سے خود بخود ایک "عالمی نظام" پیدا ہو جائے گا۔ ان کا استدلال یہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ ہمیں عالمی تنظیم کی اشد ضرورت ہوگی اس لیئے یہ دفعتہً ظہور میں آجائے گی۔ یہ عقیدہ قطعاً بے بنیاد ہے کہ محض ضرورت طبیعی یا معاشرتی ایجاد کا باعث ہوتی ہے۔ اگر ضرورت ہی واحد فیصلہ کن امر ہوتی تو ہوائی جہاز اور سلفا دوائیں صدیوں پہلے ایجاد ہو گئی ہوتیں۔ یہ ایجادیں جبھی ہو سکیں کہ تحقیق نے مادی، حیاتی اور سائنسی بنیادوں کو استوار کیا۔ بعض لوگ عالمی تنظیم کی کامیابی پر شبہ کرنے میں حق بجانب ہیں جب تک اس کے لیئے ضروری "اخلاقی" بنیاد کھڑی نہ ہو جائے۔ ان کا خیال ہے کہ ایک بہت زیادہ تباہ کن ایٹم بم کی تیاری سے یہ اخلاقی بنیاد مہیّا ہو گئی ہے۔ موجودہ عالمی تنظیم کے مخصوص سوالوں سے قطع نظر اکثر ماہرین اس پر متفق ہیں کہ جوہری طاقت ایک ایسی تنظیم باعث ہوگی جس میں نہ صرف قومی بلکہ بین اقوامی پیمانے پر اعلیٰ مرکزی اختیار ہوگا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مجموعیاتی حکومتوں کا انفرادی زندگیوں پر کیا اثر ہوتا ہے۔ اس کے پیش نظر مذکورہ بالا امکان مختلف نصب العین والی قوموں کے لیئے تشویش کا باعث ہے۔

لگی پٹی کے بغیر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ معاشرتی علوم کی موجودہ ترقی کے پیش نظر قومی یا بین اقوامی معاشروں کا نظم و نسق غالباً اُنہی طریقوں سے جاری ہو سکتا ہے جو مجموعیاتی حکومتوں کا اب تک خاصہ رہا ہے۔ یعنی تمام مخالفت کو بے دردی سے کچلنا اور لوگوں کی بڑی تعداد کو بھوکوں مارنا یا ضروریات سے محروم رکھنا، کیونکہ ابھی تک یہ معلوم نہیں کہ حکومت کا اختیار مرکز میں جمع کرنے کے ایسے مصارف سے کیسے رہائی ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی لیڈر، خواہ وہ کتنا ہی قابل اور نیک نیت ہو، آج کل کسی بڑے معاشرے کا نظم و نسق مرکز سے چلانا چاہیئے تو وہ ایک ہوا باز کے مانند ہوگا جو کسی جدید ہوائی جہاز کو تختۂ آلات یا نقشوں کے بغیر اُڑانے کی کوشش کرے۔ ظاہر ہے کہ اڑان آرام دہ نہیں ہوگی۔ اگر اسے کامیابی ہو بھی جائے تو یہ انسانوں اور سامانی کی بڑے پیمانے پر تباہی کے بغیر نہ ہوگی۔ کامیاب ہوا بازی کے لئے یہ شرطیں ضروری ہیں: ہوائی جہاز کے آلات کی درستی اور موزونیت، نقشے جن سے ہوائی جہاز کا راستہ معین کیا جا سکے، ہوا باز کی تربیت جس سے وہ انہیں صحیح طرح پڑھ سکے۔ صرف بنیادی طبیعیاتی سائنسوں کی ترقی ہی سے آج کل کا ہوائی جہاز بنایا یا اُڑایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح معاشرتی علوم ہی کی ترقی سے کوئی قابل عمل عالمی تنظیم بنائی یا چلائی جا سکتی ہے۔ یہ بڑی خطرناک بات ہے کہ آج کل حکومت

کے دیانت دار سربراہ کو بھی ناقص اور ناکافی معلومات کی بنا پر نظم ونسق چلانا پڑتا ہے۔

تو سوال یہ رہ جاتا ہے: کیا ہم سائنس پر اعتماد کریں یا کسی اور چیز پر؟ جہاں تک ہماری طبیعی مشکلات کا تعلق ہے ہم نے اس کا جواب پہلے ہی دے دیا ہے۔ جس وقت ہم اپنے معاشرتی مسائل سے بھی اسی طرح نمٹنے کا فیصلہ کریں گے ہم امید افزا جانب میں قدم بڑھانا شروع کر دیں گے۔ گو اس سوال کا جواب بالآخر ہر ایک کو دینا پڑے گا۔ لیکن سب سے پہلے خود سائنس دانوں، قانون ساز مجلسوں اور ان مؤسسوں اور افراد کو دینا ہوگا جو تحقیق اور تعلیم کے مصارف مہیا کرتے ہیں۔ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہوا تو معاشرتی تحقیق کے ایسے ادارے ظہور میں آئیں گے جو طبیعیاتی تحقیق کے بہترین امریکی اداروں کے ہم پلہ ہوں گے۔ کچھ عرصے سے طبیعیاتی تحقیق کے ان اداروں کے ضامن یہ سوچ رہے ہیں کہ آیا معاشرتی مسائل کا حل تلاش کرنے کا بھی یہی طریقہ تو نہیں۔ جب وہ معاشرتی تحقیق کو طبیعیاتی تحقیق کی طرح فراخ دلی سے مالی امداد دینے کا فیصلہ کرلیں گے تو وہ ویسے ہی نتائج حاصل کرلیں گے۔

آخر میں ہم چند الفاظ ان سے کہنا چاہتے ہیں جو خیال کرتے ہیں کہ سائنس کے طریقے بڑے سست ہیں۔ وہ پوچھتے

رہیں کہ جب تک معاشرتی علوم پوری طرح ترقی نہیں کر لیتے اس اثنا میں ہم کیا کریں۔ ظاہر ہے کہ ہم مصیبتیں جھیلتے رہیں گے۔ انتظامی صیغے تیاقے اور وجدان کی بنا پر فیصلے کرتے رہیں گے اور اپنے ضمیر کی آواز کو آواز خلق یا آواز خدا سمجھتے رہیں گے۔ آخر مخدرات، ٹیکوں اور سلفا دواؤں سے پہلے وقتوں میں بھی زندگی چلتی ہی رہی۔ ان دنوں بھی فوری اور ضروری مسئلے لوگوں کے در پیش تھے۔ لیکن چند افراد نے اپنے آپ کو تحقیق کے لئے وقف کر دیا جس سے اس وقت کے مسئلے تو حل نہ ہوئے لیکن جس نے ہماری دنیا کی کایا پلٹ دی ہے۔ ہم سرطان کی تحقیق چھوڑ تو نہیں دیتے کیونکہ سرطان کے مریض اس سے شفایاب نہیں ہو رہے۔ اگر ہم ایسی دوا پر ہی اصرار کرتے ہیں جو مرض کو یقینی طور پر اچھا کر دے تو ہم اس کے دریافت ہونے تک بہت زیادہ بیمار ہو جائیں گے۔

لیکن گو کوئی سائنس ابھی نشو و نما کی منزلیں طے کر رہی ہو ہم اس کے نتائج سے پھر بھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ سائنس نشو و نما ہی ہوتی ہے فوری انکشاف نہیں ہوتی۔ ہم اسے نشو و نما کے دوران میں بھی نامکمل اور جزوی طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ اگر ہم سائنس پر پورا اعتماد کر لیں تو ہمیں ایسا یقین محکم حاصل ہو جائے گا جو کئی پرانے یقینوں سے زیادہ ہماری

وفاداری کا مستحق ہوگا۔ اور ہم اسے عملی جامہ پہنانے کی رفتار بھی تیز کر دیں گے۔